قومی زبان

انجمن ترقی اُردو پاکستان

Now Take 10 Months Salary in Advance

More than 260,000 Customers in 1 year

NBP Advance Salary

- Easiest facility for 1-60 months
- Fastest processing & immediate disbursement
- No guarantee required
- No collateral or insurance requirement
- No minimum income requirement
- No processing fee or hidden charges

Applicable for permanent Govt., related organizations and scheduled banks' employees receiving salaries through NBP. For details contact your salary disbursing branch.

www.nbp.com.pk

NBP

National Bank of Pakistan

The Nation's Bank

ماہنامہ

قومی زبان

کراچی

بانی: بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

قومی زبان، نومبر ۲۰۰۴، جلد: ۷۶، شمارہ: ۱۱

جاری شدہ: پاکستان میں ۱۹۴۸ء

مضمون نما

روایتی تنقید پر ایک اور نظر	پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر	۵
اقبال کا دوسرا خطبہ۔ تنقیدی و تحقیقی جائزہ	پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف اعوان	۱۳
فکر اقبال کے ارتقا کے روشن زاویے	ڈاکٹر صابر حسین جلیسری	۲۹
اقبال اور نطشے	ثناء الرحمان	۳۹
عمرانی نقطہ نظر سے اقبال کا تصور ملت	بشریٰ لطیف	۴۳
خصوصی گوشہ۔ افتخار احمد عدنی		۴۷
غالب کے فارسی کلام کے اردو، انگریزی ترجمے	افتخار احمد عدنی / رالف رسل	۴۸
قطع تاریخ	مختار اجمیری	۵۲
کچھ اور کٹھ پتلیاں	افتخار احمد عدنی	۵۳
آمنہ آپا..... افتخار عدنی	جمیل الدین عالی	۶۷
چودھری محمد علی ردولوی کی مزاح نگاری	ڈاکٹر ثریا شمیل	۷۳
تدوین کلام ذوق	صباحت قمر	۸۵
رفتار ادب	ا۔ س	۹۰
گرد و پیش		۹۸

ادارۂ تحریر

ادا جعفری

جمیل الدین عالی

مشفق خواجہ

مُدیر

ادیب سہیل

بدلِ اشتراک

فی پرچہ ——— ۱۰ روپے

سالانہ عام ڈاک سے — ۱۱۰ روپے

سالانہ رجسٹری سے — ۲۳۰ روپے

بیرونِ ملک

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ/۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ/۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اُردو پاکستان

شعبۂ تحقیق

ڈی-۱۵۹، بلاک ۷، گلشنِ اقبال

کراچی ۷۵۳۰۰

فون: ۴۸۱۱۴۰۶ - ۴۹۷۳۲۹۶

کھانسی، نزلہ، زکام ـ کسی موسم یا کسی وقت کے پابند نہیں
ہمدرد کی مجرّب دوائیں ان کا علاج بھی ہیں اور ان سے محفوظ رہنے کی مؤثر تدبیر بھی

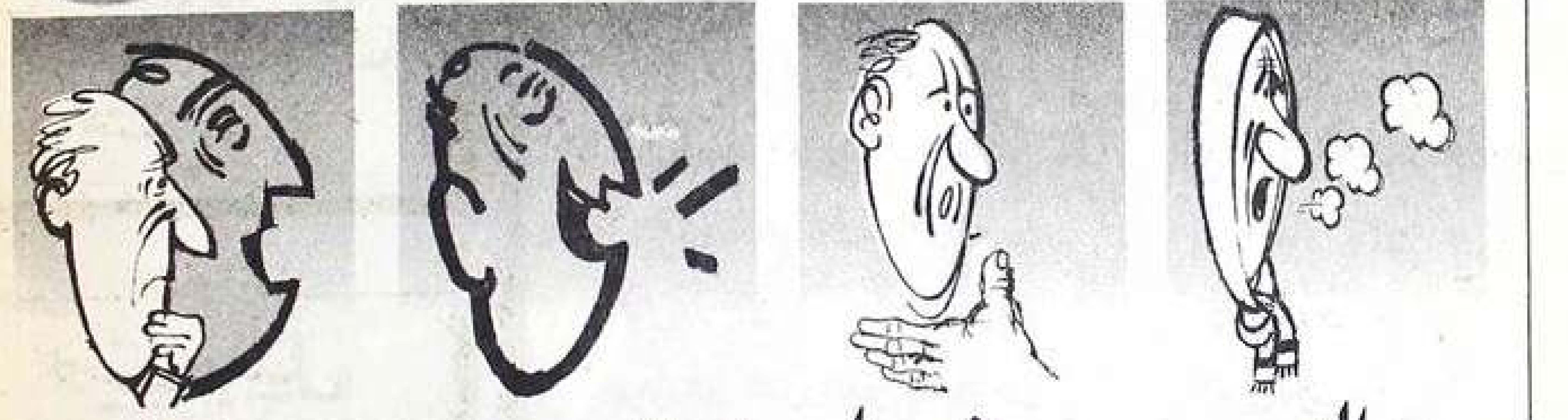

سُعالین

مُفید جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ سُعالین، گلے کی خراش اور کھانسی کا آسان اور مؤثر علاج ـ آپ گھر میں ہوں یا گھر سے باہر، سرد و خشک موسم یا گرد و غُبار کے سبب گلے میں خراش محسوس ہو تو فوراً سُعالین لیجیے ـ سُعالین کا باقاعدہ استعمال گلے کی خراش اور کھانسی سے محفوظ رکھتا ہے۔

جوشینا

تیار جوشاندہ

نزلہ، زکام، فلُو اور اُن کی وجہ سے ہونے والے بخار کا آزمودہ علاج ـ
جوشینا کا روزانہ استعمال موسم کی تبدیلی اور فضائی آلودگی کے مُضر اثرات بھی دُور کرتا ہے ـ
جوشینا بند ناک کو فوراً کھول دیتی ہے ـ

لعوق سپستاں

نزلے زکام میں سینے پر بلغم جم جانے سے شدید کھانسی کی تکلیف طبیعت نڈھال کر دیتی ہے ـ
اس صورت میں صدیوں سے آزمودہ ہمدرد کا لعوق سپستاں، خشک بلغم کے اخراج اور شدید کھانسی سے نجات کا مؤثر ذریعہ ہے ـ

ہر موسم میں، ہر عمر کے لیے

صُدوری

مؤثر جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ خوش ذائقہ شربت ـ خشک اور بلغمی کھانسی کا بہترین علاج ـ صُدوری سانس کی نالیوں سے بلغم خارج کر کے سینے کی جکڑن سے نجات دلاتی ہے اور پھیپھڑوں کی کارکردگی کو بہتر بناتی ہے ـ بچّوں، بڑوں سب کے لیے یکساں مُفید ـ

سُعالین، جوشینا، لعوق سپستاں، صُدوری ـ ہر گھر کے لیے بے حد ضروری

ہمدرد

ہمدرد کے متعلق مزید معلومات کے لیے ویب سائٹ ملاحظہ کیجیے:
www.hamdard.com.pk

مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ ـ

Delta Dot

Adarts-SJLS-1/2001

اداریہ

گزشتہ دنوں اُردو ادب کی تین اہم اور قابلِ ذکر شخصیات یکے بعد دیگرے ہمیں دائمی مفارقت دے گئیں۔ اُن میں جناب اشفاق احمد کا لاہور میں، جناب تابش دہلوی اور جناب افتخار احمد عدنی کا کراچی میں انتقال ہوا۔ جناب اشفاق احمد اردو کے جانے مانے افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار تھے۔ جناب تابش دہلوی نے شاعری میں دبستانِ دہلی کی نمائندگی کی وہ حضرت بیخود دہلوی کے مشاعرے میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں دلّی کی جدید شعری روایت کی خصوصیات ملتی ہیں۔

کل نفس ذائقة الموت ایک اٹل حقیقت ہے۔ لیکن کسی شخصیت کی موت پر غم کا اظہار کرنا بھی بشری تقاضا ہے۔ اس ناتے ہم ان حضرات کے سانحۂ ارتحال پر سوگوار ہیں اور مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔

افتخار احمد عدنی صاحب کے انتقال پر انجمن کے اراکین دہرے غم سے دوچار ہوئے ہیں۔ اوّل عدنی صاحب معتبر ادیب اور صاحبِ تصنیف و تالیف تھے۔ دوم وہ انجمن کے متولی و خازن اعزازی تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ طبعاً مہربان و شفیق تھے، دمِ گفتار نرم لب ولہجہ سے مخاطب ہوتے تھے۔ یہ طرزِ مخاطبت فی زمانہ عام نہیں، خال خال دیکھنے میں آتا ہے۔ ان ہی معنوں میں عدنی صاحب (اللہ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے) کی حیثیت ہمارے لیے مختنم ہے۔

انجمن کی تازہ مطبوعات

نام کتاب	مصنف	قیمت
۱۔اردو ناول کے چند اہم زاویے	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	160/-
۲۔حرفے چند (جلد سوم)	جمیل الدین عالی	100/-
۳۔سرسید احمد خاں، حالات و افکار	بابائے اردو مولوی عبدالحق	75/-
۴۔افکارِ عالیہ	خان رشید/ قاضی قیصر الاسلام	130/-
۵۔اردو کی ادبی تاریخیں	ڈاکٹر گیان چند	450/-
۶۔ملت اسلامیہ	علی نواز میمن/ صفوت قدوائی	250/-
۷۔غالب کے چند پہلو	شمس الرحمٰن فاروقی	100/-
۸۔پاکستان ایک اشرافی ریاست کی معیشت	ڈاکٹر عشرت حسین	480/-
۹۔انجمن ترقی اردو کا المیہ	بابائے اردو مولوی عبدالحق	75/-
۱۰۔منتشر یادیں	نور الحسن جعفری	150/-
۱۱۔اردو کی منظوم داستانیں	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	350/-
۱۲۔غالب کی بعض تصانیف	کالی داس گپتا رضا	120/-
۱۳۔تاریخ انجمن بابائے اردو کے بعد	شہزاد منظر/ تکملہ: ادیب سہیل	175/-
۱۴۔اشاریہ اردو (جلد دوم)	مصباح العثمان	100/-
۱۵۔تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت (جلد اول)	سید ہاشمی فرید آبادی	250/-
۱۶۔تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت (جلد دوم)	سید ہاشمی فرید آبادی	300/-
۱۷۔غالب ایک مطالعہ	ممتاز حسین	150/-
۱۸۔غالب درونِ خانہ	کالی داس گپتا رضا	350/-
۱۹۔اردو ادب کی جستجو	رالف رسل	350/-
۲۰۔مقالات مرزا محمد سعید	شیما مجید	125/-
۲۱۔جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری	ڈاکٹر ناہید قاسمی	400/-

تعزیتی اجلاس بیاد حضرت تابش دہلوی میں دائیں سے بائیں: جناب جمیل الدین عالی، جناب مسلم شمیم اور جناب سعود تابش

تعزیتی اجلاس بیاد حضرت تابش دہلوی کے شرکاء

تعزیتی اجلاس بیادِ حضرت تابش دہلوی کی تقریب میں جناب جمیل الدین عالی حاضرین سے مخاطب ہیں

تقریب کے صدر جناب مسلم شمیم حاضرین سے کلام کر رہے ہیں

روایتی تنقید پر ایک اور نظر

پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر

انیسویں صدی کے آخر میں لاہور میں بھی دہلوی لکھنوی چشمک موجود تھی۔ اقبال ۱۸۹۵ء میں لاہور آئے تھے۔ اسی سال "انجمن اتحاد" کے مشاعروں کا آغاز ہوا۔ مرزا ارشد گورگانی ان مشاعروں میں شرکت کے لیے فیروزپور سے لاہور آیا کرتے تھے۔ ان کا تعلق دبستانِ دہلی سے تھا۔ میر ناظر حسین ناظم لکھنوی دبستان سے وابستہ تھے۔ دونوں صاحبان اپنے اپنے شاگردوں کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ اقبال نے بھی اپنا کلام سنانا شروع کر دیا۔ ان کی ایک غزل کا یہ مقطع لائق توجہ ہے:

اقبال لکھنؤ سے، نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے (۱)

کچھ تعطل کے بعد ۱۸۹۷ء میں لٹریری سوسائٹی کا احیا ہوا۔ اس کے احوال بیان کر کے محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں:

> لٹریری سوسائٹی کے یہ مشاعرے کچھ عرصے تو یونہی چلتے رہے۔ لیکن شاعرانہ چشمک اور نوک جھونک کی بنا پر بعد میں اس کا بائیکاٹ کر علاحدہ ہو گیا۔ جس نے "بزمِ قیصری" کی صورت اختیار کر لی... میر ناظر حسین ناظم لکھنوی اس کے کرتا دھرتا تھے... مشاعرہ اتحاد میں مرزا ارشد گورگانی مرحوم کے شاگردوں اور مداحوں کا زور تھا۔ اس کتا چھنی اور چھیڑ چھاڑ کو یہاں تک ترقی ہوئی کہ ناظم صاحب کے ایک شاگرد غلام حسین خان کا تخلص ارشد اور ارشد گوگانی کے ایک شاگرد منشی غلام محمد کا تخلص ناظم رکھا گیا۔ (۲)

اقبال کا تعلق مشاعرۂ اتحاد سے رہا، تاہم وہ خمِ زلفِ کمال کے اسیر تھے اور کمال ہی کی راہ پر گامزن رہے۔

(۲)

یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ اعتراض کرنا اہلِ زبان کی عادت تھی۔ اس ضمن میں دہلی والوں کی نسبت لکھنؤ والے زیادہ تیز تھے۔

لکھنوی دبستان دہلوی دبستان کے مقابلے پر قائم ہوا تھا اور مقابلے ہی میں مبتلا رہا۔ بڑے شعرا کی باہمی رقابتیں ایک الگ مسئلہ رہا ہے۔ صدیوں کی ان روایات کے برعکس حکیم فرزانہ مرزا غالب اپنے ایک شاگرد کو لکھتے ہیں کہ، "تم اپنی تکمیل کی فکر کرو، زنہار کسی پر اعتراض نہ کیا کرو۔" (۳) اگرچہ خود مرزا غالب اعتراض کرنے سے بچ نہ سکے اور اس کا نقصان بھی اٹھایا۔ (۴) غالب کے اس جملے میں دو رویوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ایک رویہ دوسروں پر اعتراضات کرنے کا ہے اور دوسرا رویہ اپنی تکمیل پر توجہ دینے کا ہے۔ پہلا رویہ منفی اور دوسرا مثبت ہے۔ اقبال کی زبان پر اعتراض کرنے والے اکثر شاعر تھے لیکن وہ بڑے شاعر نہ بن سکے۔ اقبال نے اپنی تکمیل کی فکر کی اور بڑے شاعر بنے۔ انھوں نے مشاعروں، ادبی جریدوں، شعری مجموعوں، دوستوں اور کتابوں کے علاوہ اعتراضات سے بھی کچھ سیکھنے کی کوشش کی۔ اقبال کی یہ کوشش علمی اور پیشہ ورانہ مصروفیات کے باوجود جاری رہی۔ انھیں زبان پر عبور حاصل ہوتا گیا اور ان کا فن نکھرتا گیا۔ اقبال کے فنی ارتقا اور ان کی شاعری کی تحسین کا اندازہ حسبِ ذیل آرا سے کیا جاسکتا ہے۔

سید میر حسن نے اقبال کی زبردست علمی وادبی تربیت کی تھی اور اقبال نے ان سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اپنے استاد سے کتابیں لے کر ان کا مطالعہ بھی کرتے تھے اسی دوران مرزا داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے شیخ عبدالقادر نے لکھا ہے:

> جناب داغ پہچان گئے کہ پنجاب کے ایک دور افتادہ ضلع کا یہ طالب علم کوئی معمولی غزل گو نہیں۔ انھوں نے جلد کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے۔ . . . اقبال نے داغ کی زندگی ہی میں قبولِ عام کا درجہ حاصل کر لیا تھا کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے جن کے کلام کی انھوں نے اصلاح کی۔ (۵)

لاہور آنے کے بعد، بی اے کی طالب علمی کے دوران، اقبال نے "انجمن اتحاد" کے مشاعروں میں شرکت کی۔ انھوں نے ۱۸۹۶ء کی نشست میں جب یہ شعر:

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

سنایا تو مرزا ارشد گورگانی نے پیش گوئی کی کہ اقبال عظیم شاعر بنے گا۔ (۶) یہ رائے اقبال کی فطری نیز اکتسابی استعداد شعر گوئی کا مظہر تھی۔

ایک نظم بعنوان "نالۂ یتیم" اقبال نے ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء کو انجمن کے اجلاس میں پڑھی۔ مولوی نذیر احمد دہلوی نے اس کی صدارت کی۔ انھوں نے کہا کہ "میں نے دبیر اور انیس کی بہت سی نظمیں سنی ہیں۔ مگر واقعی ایسی دل شگاف نظم کبھی نہیں سنی۔" (۷)

فروری ۱۹۰۴ء میں "علی گڑھ منتھلی" میں حاجی محمد خان کا ایک طویل مضمون بعنوان "اردو ادب میں فنِ تنقید کی کمی" شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے لکھا کہ:

> اقبال کی شاعری میں ابھی سے وہ باتیں پائی جاتی ہیں جن سے ان کی طرز کی دائمی مقبولیت کا پتا چلتا

ہے۔ شعرائے اردو کی لمبی فہرست میں ایک مرزا غالب ہی ایسے شاعر ہیں جن کے کلام کو بلحاظ جذبات و محسوسات کلامِ اقبال پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔(۸)

بدرالدین قیصری کی ایک نظم ''مخزن'' میں مئی ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ نثری تمہید میں انھوں نے لکھا کہ ''میرے خیال میں اقبال کی شاعری کا پایہ ان کی شہرت سے بلند تر ہے۔'' نظم کے چند مصرعے اور ایک شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

ع شمع ہے تو شاعری کی انجمن کے واسطے
ع چست تیری بندشیں سب سے جدا طرز بیاں
ع خطۂ ہندوستاں میں غالبِ ثانی ہے تو
ع چشمۂ کوثر میں ہے دھوئی ہوئی تیری زباں

یہ کہیں روح القدس کی کارفرمائی نہ ہو
شعر کے پردے میں اعجاز مسیحائی نہ ہو (۹)

نومبر ۱۹۰۴ء میں حسرت موہانی نے ''تنقید مخزن'' کے عنوان سے ''اردوئے معلیٰ'' میں ایک مضمون شائع کیا۔ اس میں لکھا تھا کہ:

اہل پنجاب میں جو لوگ منصف مزاج ہیں اور صحتِ زبان کے خواستگار ہیں وہ اپنی غلطیوں کو چھوڑتے جاتے ہیں اور نکتہ چینوں کی نکتہ چینی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر اقبال صاحب... حضرتِ اقبال کی نظمیں روز بروز زبان کے لحاظ سے صاف ہوتی جاتی ہیں۔(۱۰)

ساقی دہلوی کی ایک غزل جنوری ۱۹۱۱ء میں ''مخزن'' میں شائع ہوئی۔ آخری شعر حسبِ ذیل ہے:

ہے شوق دید حضرتِ اقبال کا ہمیں
کس دن ملیں گے دیکھیے جادو نوا سے ہم (۱۱)

دسمبر ۱۹۱۱ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی میں ممتاز شخصیات اور سربرآوردہ فضلا کی موجودگی میں اقبال کو ''ملک الشعرا'' کا خطاب دیا گیا اور اس موقع پر مولانا شبلی نے ان کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے۔(۱۲)

اگست ستمبر ۱۹۲۲ء کے ''نقیب'' میں وحید احمد مسعود بدایونی کا ایک مضمون بعنوان ''ڈاکٹر شیخ محمد اقبال آبِ حیات کے دورِ حاضر کا جرعہ تیز'' شائع ہوا۔ اقبال کی زبان کے بارے میں انھوں نے حسبِ ذیل رائے کا اظہار کیا:

حیرت ہوتی ہے کہ باوجود دہلوی اور لکھنوی نہ ہونے کے یا صاف صاف کہا جائے تو باوجود پنجابی ہونے کے اقبال اس قدر دلآویز، صاف اور منجھی ہوئی زبان کس طرح لکھتا ہے۔(۱۳)

(۴)

ان آرا کے تناظر میں معترضین کی روش ان کی اپنی تنگ نظری اور کم علمی کا مظہر ہے۔ "اودھ پنچ" نے "صبح روشن" جیسی صاف اور دلکش ترکیب کو "نئی ترکیب" کہہ کر مسترد کر دیا۔(۱۴) جوش ملسیانی نے لکھا کہ "اقبال کے ہاں اصولِ فن کے عیوب قلیل نہیں بلکہ کثیر ہیں۔"(۱۵) ایسی بات نہیں تھی۔ ملسیانی کا علم کم اور تعصب زیادہ تھا۔ انھوں نے "خطرۂ سحر" کی ترکیب پر اعتراض اپنی کم علمی کی وجہ سے کیا۔"(۱۶) اکبر حیدری نے لکھا ہے کہ "انصاف کی بات یہ ہے کہ اودھ پنچ کی نظر میں اقبال کی معمولی سی لغزش شہتیر کی طرح کھٹکتی ہے۔"(۱۷) حقیقت یہ ہے کہ "اودھ پنچ" کے اکثر و بیشتر اعتراض فضول ہوتے تھے۔ یہی حال جوش ملسیانی اور سیماب اکبر آبادی وغیرہ کا ہے۔ اثر لکھنوی نے سیماب کے اعتراضات کا جائزہ لیا تو بیشتر غلط نکلے۔ جوش ملسیانی کے ایک معمولی اعتراض پر تبصرہ کرتے ہوئے سراج لکھنوی نے حسبِ ذیل رائے ظاہر کی ہے:

> ایک ایک نقطہ پر اگر ایسی ہی گہری نظریں ڈالی جائیں اور پھر اعتراض بھی ایک نقطہ خیال فرض کر کے کیا جائے تو پھر اقبال کیا کسی کا بھی کوئی شعر نہیں رہ سکتا... اس قسم کے اعتراضات سے تنگ نظری ٹپکتی ہے اور تعصب کی بو نہیں بلکہ بھپکے آتے ہیں اور آپ کے دیانت دارانہ مقصد میں خلل و شبہ پیدا ہوتا ہے۔"(۱۸)

سراج لکھنوی کی رائے درست اور عبرت انگیز ہے۔ اگر مقصد اعتراض کرنا ہو؛ یہ تحقیق کیے بغیر کہ وہ صحیح ہے، غلط ہے یا لغو ہے، تو ہر شعر پر کیا جا سکتا ہے۔ اہلِ زبان اور اہلِ پنجاب کے مابین ادبی معرکے کے دوران سری نگر کے نور الدین عنبر نے "تنقید دلچسپ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں حسرت موہانی کے کلام پر تنقید کی اور اس کا بخیہ ادھیڑ دیا۔(۱۹) اسی طرح کسی نے "تحقیق" کے فرضی نام سے ایک مضمون بعنوان "اصلاح حسرت" میں "اردوئے معلّٰی" ستمبر ۱۹۰۴ء کے بعض جملوں اور حسرت کی ایک غزل کو ہدفِ تنقید بنایا اور اس کی مٹی پلید کر دی۔(۲۰)

حقیقت یہ ہے کہ بڑے سے بڑے شاعر کے کلام میں کیڑے نکالنا چاہیں تو نکال سکتے ہیں۔ ہر بڑے شاعر کے ہاں کچھ فروگذاشتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان پر اعتراضات بجا بھی ہوتے ہیں۔ کلامِ اقبال پر جو اعتراضات کیے گئے ان میں سے متعدد درست تھے، خصوصاً وہ جو اس کے ابتدائی کلام پر کیے گئے۔ تاہم اقبال کے فنی عیوب کثیر نہیں قلیل تھے۔ ان پر اعتراضات اس لیے نہیں ہوئے کہ وہ واقعی کثیر تھے بلکہ اس لیے ہوئے کہ معترضین اعتراض کرنے کے شوقِ فضول میں بری طرح مبتلا تھے۔ چناں چہ جوش ملسیانی کے بارے میں، ایک اور مقام پر، سراج لکھنوی نے اپنی رائے ان الفاظ میں پیش کی ہے "سخن فہمی کا یہ عالم ہے اور اعتراض کرنے کا شوق اپنی حدوں سے تجاوز کیے ہوئے ہے۔"(۲۱)

(۴)

اگر معترضینِ اقبال، اعتراضات پر زور صرف کرنے کے بجائے اپنی تکمیل پر توجہ دیتے، جیسا کہ مرزا غالب نے اپنے شاگرد کو نصیحت کی تھی تو ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ زیادہ زور شور سے اعتراضات جوش ملسیانی نے کیے ہیں جب کہ بحیثیت شاعر وہ اقبال کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنے نزدیک انھوں نے کلامِ اقبال میں جو غلطیاں تلاش کیں، ان کا ارتکاب خود بھی کیا ہے۔

اقبال کا شعر ہے:

کیا کہوں اپنے چمن سے میں جدا کیوں کر ہوا
اور اسیرِ حلقۂ دامِ ہوا کیوں کر ہوا (۲۲)

اس شعر پر اعتراض کرتے ہوئے ملسیانی نے لکھا ہے کہ "مطلع میں ربطِ کلام پیدا کرنے کے لیے حرفِ عطف کی ضرورت پڑے۔ اس سے زیادہ عجزِ طبیعت اور کیا ہوگا۔ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ "اور اسیر" کی جگہ "پائے بند" کہہ دیتے: پائے بند حلقۂ دام ہوا کیوں کر ہوا۔" (۲۳)

اقبال کا ایک اور شعر ہے:

ہے شکستِ انجام غنچے کا سبو گلزار میں
سبزہ و گل بھی ہیں مجبورِ نمو گلزار میں (۲۴)

جوش ملسیانی نے مندرجہ بالا اعتراض سے صرف ایک صفحہ آگے، اقبال کے اس شعر کی، یوں اصلاح کی ہے:

ہے شکستِ انجام غنچے کا سبو گلزار میں
اور خزاں ہے سبزہ و گل کی عدو گلزار میں

سراج لکھنوی لکھتے ہیں کہ:

"جس حرفِ عطف پر اعتراض تھا اس کو خود جناب نے بھی صرف فرما کر اپنے عجز کا ثبوت دیا ہے۔" (۲۵) بشیر نکودری نے بھی اس پر عبرت انگیز تبصرہ کیا ہے۔ (۲۶)

اقبال کے مصرع: "آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی" (۲۷) میں لفظ "سکھلاتی" پر ملسیانی کو اعتراض ہے۔ ان کے نزدیک "سکھلاتی" کا لام زائد ہے۔ (۲۸) اس "غلطی" کا ارتکاب خود بھی کیا ہے اور نثر میں کیا ہے۔ مذکورہ اعتراض سے کچھ صفحات آگے چل کر لکھتے ہیں: "گھوڑوں کو طرزِ خرام سکھلانے کے لیے کسی شمع کی ضرورت نہیں ہوتی۔" (۲۹)

"اقبال کی خامیاں" میں ملسیانی کی نثر پر سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو اس میں دلچسپ خامیاں نظر آتی ہیں۔ مثلاً اقبال کی فارسیت پر جہاں اعتراض کیا ہے وہاں خود "لزوم مالا یلزم" کے الفاظ اپنے مفہوم کی وضاحت کے لیے استعمال کیے ہیں۔ (۳۰) "حشو،

زوائد" پر اعتراضات کے لیے یہ عنوان قائم کیا ہے: "بے ضرورت الفاظ اور حشو وزوائد" ظاہر ہے کہ "بے ضرورت الفاظ" لکھنے کے بعد "حشو وزوائد" لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ حد یہ ہے کہ جوش ملسیانی نے "کلامِ اقبال کی خامیاں" بیان کرنے کے لیے عنوان "اقبال کی خامیاں" قائم کیا ہے۔

"تنقید ہمدرد"... "اودھ پنچ"... عبدالسلام ندوی اور سہیل بخاری وغیرہ کی تحریریں بھی اغلاط سے پاک نہیں۔(۳۱) ایسی صورت میں اقبال کی زبان کو ہدفِ اعتراض بنانا معترضین کی بد توفیقی ہے۔

"اقبال کی خامیاں" کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

> اقبال کی شاعرانہ قابلیت اور زورِ تخیل سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ دنیائے شاعری میں اس کی شہرت لاثانی ہے۔ اس کی طبیعت دریائے مواج ہے جس کی بے قرار لہریں سرزمین پنجاب کے دریاؤں کو پر شور بنا کر عجم اور عرب کے صحرائی ذروں کو دلِ بے تاب بنا رہی ہیں۔ کلام کی پاکیزگی اور اس کے ساتھ ساتھ واقعاتِ حاضرہ کی سچی تصویر اسے ترجمانِ حقیقت کہے جانے کی شہادت دیتی ہے... مگر اس میں کیا راز ہے کہ اس کو اتنے حسنِ قبول، اتنی خوش کلامی اور اتنی کہنہ مشقی کے باوجود اب تک درجہ استناد حاصل نہیں ہے۔ ذوقِ سلیم اسے تکمیلِ فن کا وہ درجہ کیوں نہیں دیتا جو جلیل، کوثر، ریاض، مضطر، نوح، یاس اور بے خود وغیرہ کو حاصل ہے۔"(۳۲)

اس کی وجہ ملسیانی کے نزدیک اقبال کے، قلیل نہیں بلکہ، کثیر فنی عیوب ہیں۔ موصوف نے ان عیوب کی جو تفصیل دی ہے اسے کسی اور نے نہیں بلکہ لکھنؤ کے ایک اہلِ زبان فاضل نے رد کر دیا۔ چناں چہ اقبال کو تکمیلِ فن کا درجہ نہ دینے کی وجہ یہ نہیں ہے جو ملسیانی نے بیان کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اقبال کا تعلق پنجاب سے تھا اور پنجاب والوں کی اردو کو اہلِ زبان مستند نہیں مانتے تھے۔ تاہم اقبال پر اہلِ زبان نے جو اعتراضات کیے ہیں ان میں سے بیشتر کا توڑ اہلِ زبان ہی نے کر دیا۔ اب یہ صورتِ حال ہے کہ اقبال کی لسانی وفنی رفعت وعظمت کا بہترین انکشاف اہلِ زبان ہی کر رہے ہیں۔ یہ بات لائقِ توجہ اور عبرت انگیز ہے اور ایک اہم نکتہ ہے۔ غالب اور اقبال کی زبان بلاشبہ معیاری زبان ہے۔ معیاری زبان قواعد میں زیادہ جکڑی ہوئی نہیں ہوتی اور نہ قواعد کی رو سے صحیح زبان لازماً معیاری زبان ہوتی ہے۔ معیاری زبان کا انحصار، قواعد کا بڑی حد تک خیال رکھتے ہوئے، زبان کے خلاقانہ استعمال پر ہے اور اس ضمن میں اردو کا کوئی شاعر غالب واقبال کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ معیاری زبان ہی معتبر اور مستند ہوتی ہے۔ اقبال کی زبان ان کے جذبہ وتخیل کا ایسا پیکر ہے کہ لفظ ومعنی کو الگ الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں۔ فنی رموز اور فکری توانائی کلامِ اقبال میں کمال کی حدوں کو چھو رہے ہیں۔ ان کا معجزۂ فکر، معجزۂ فن بن کر نمودار ہوا ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> اقبال کی شاعری اور ان کے افکار کے سمت ورفتار کے مطالعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اقبال نے فن کے رموز، زبان کی اہمیت اور شاعری میں فکر، جذبہ اور تخیل کے مقامات پہچاننے میں کتنا

ریاض کیا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاعری نے اقبال کو اقبال بنانے میں اپنی ساری آزمائشیں ختم کر دی ہوں اور ان کے بعد ان پر اپنی ساری نعمتیں بھی تمام کر دی ہوں جیسے اردو شاعری کا دین اقبال پر مکمل ہو گیا ہو۔ (۳۳)

حوالے و حواشی:

(ا۔۲) دیکھیے "حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں"، مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، صفحات ۷۵، ۹۵

(۳) یہ جملہ لکھنے سے قبل غالب نے تذکیر و تانیث کے بارے میں حسب ذیل رائے ظاہر کی:

پورب کے ملک میں جہاں تک چلے جاؤ گے، تذکیر و تانیث کا جھگڑا بہت پاؤ گے۔ سانس میرے نزدیک مذکر ہے لیکن اگر کوئی مونث بولے گا تو میں اس کو منع نہیں کر سکتا۔ خود سانس کو مؤنث نہ کہوں گا۔

"عود ہندی" مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل، ص ۱۷۵

(۴) "برہانِ قاطع" پر غالب نے "قاطع برہان" لکھ کر اعتراضات کیے۔ اس کے نتیجے میں جو معرکہ آرائی ہوئی اس سے غالب کا خاصا وقت برباد ہوا۔

(۵) دیباچہ، بانگ درا۔

(۶) حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں، ص ۵۳

(۷) ابتدائی کلام اقبال، صفحات ۶۸۔۶۹

(۸) "اقبال کی زبان پر ایک ادبی معرکہ" اکبر حیدری کشمیری، مشمولہ "صحیفہ"، اکتوبر دسمبر ۱۹۹۴ء، ص ۲۹

(۹ تا ۱۲) تفصیل کے لیے دیکھیے، "اقبال کی صحت زبان"، صفحات (بالترتیب) ۸، ۹، ۱۹۰، ۱۰، ۱۴

(۱۳) نقدِ اقبال حیاتِ اقبال میں، مرتبہ ڈاکٹر تحسین فراقی، ص ۹۱

(۱۴) تفصیل کے لیے دیکھیے، "اقبال کی صحتِ زبان"، ص ۲۶

(۱۵) اقبال کی خامیاں، ص ۴

(۱۶) "خطرہ" بہ سکون ط کو ملسیانی نے غلط قرار دیا۔ (اقبال کی خامیاں، ص ۲۲) ان کے خیال میں "خطر" سے "خطَر" بنا چاہیے۔ (جیسے غَلط غَلطی)۔ لیکن ایسا ہے نہیں۔ مرزا غالب کا مصرع ہے: بنائیں قدر کی غزلیں جناب غالب نے۔ غالب نے لکھا ہے کہ "غزل کی زے یہاں ساکن ہے لیکن یہ سکون جائز ہے۔" (غالب کے خطوط، جلد چہارم، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، ص ۱۴۳۱)، "غزلیں" میں زے لازماً ساکن ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ "غزَلیں" میں مسلسل تین حرکتیں ہیں اور یہ بات اردو کے صوتی رجحان کے منافی ہے۔

(۱۷ تا ۲۱) دیکھیے، "اقبال کی صحتِ زبان"، صفحات (بالترتیب) ۲۷، ۲۵۶، ۱۵۲ تا ۱۵۸، ۱۹۲ تا ۲۰۳، ۲۵۴

(۲۲) بانگِ درا، ص ۱۰۲

(۲۳) اقبال کی خامیاں، صفحات ۶۰۔۶۱

(۲۴) بانگِ درا، ص ۲۵۳

(۲۵) اقبال کی صحتِ زبان، ص ۲۵۷

(۲۶) بشیر نکودری لکھتے ہیں:
گویا اس شعر کے مصرع ثانی میں تو حرف عطف جائز ہے اور علامہ مرحوم نے جو لکھا تھا وہ ناجائز تھا۔ "فاعتبروا یاولی الأبصار" کیسی مخالفانہ روش اور ریاکارانہ چال ہے! یہ تنقید تعمیری نہیں تخریبی ہے۔ یہ خدمتِ ادب نہیں تضحیکِ ادب ہے۔ دنیائے اخلاص ان کی اس کارروائی کو کبھی استحسان کی نظروں سے نہ دیکھے گی۔ (ناقدانِ اقبال، ص ۳۹)

(۲۷) بانگِ درا، ص ۱۷۰

(۲۸ تا ۳۰) اقبال کی خامیاں، صفحات (بالترتیب) ۵۳، ۶۲، ۳۶

(۳۱) "تنقید ہمدرد" کا ایک جملہ ہے: "اس کی ہر بند میں ایسی غلطیاں زبان و محاورے کی موجود ہیں جن کو ارباب مذاق کبھی گوارا نہیں کر سکتے۔" ("اردو زبان پنجاب میں" مشمولہ "اقبال کی صحتِ زبان"، ص ۱۰۲) "بند" مذکر ہے۔ لکھنؤ والے اسے بے شک مؤنث لکھتے رہیں۔ "زبان و محاورے" غلط ہے۔ "و" سے ترکیب بنائیں تو "زبان و محاورہ" بنے گی۔ نیرنگ نے لکھا تھا کہ "یہ زبان و محاورے کی" قابلِ غور ہے۔ "زبان اور محاورے کی" ہونا چاہیے۔" (اقبال کی صحتِ بان، ص ۱۱۹) اس کا کوئی جواب "تنقید ہمدرد" نے نہ دیا۔ دراصل "محاورہ" چوں کہ زبان میں شامل ہے اس لیے حشو ہے۔ "ایسی غلطیاں زبان کی موجود ہیں" لکھنا چاہیے تھا۔

"اودھ پنچ" نے اقبال کی نظم "پرندے کی فریاد" کی، بصورت مخمس، تضمین کہی۔ ایک بند حسب ذیل ہے:

خنجر چلے گلے پر جس طرح خود کشی میں
متوالہ کوئی جھومے یا خود فراموشی میں
یا اونگھ اونگھ چونکے افیونی بے ہوشی میں
پتوں کا ٹہنیوں میں وہ جھومنا خوشی میں

(اقبال کی صحتِ زبان، ص ۲۰)

ٹھنڈی ہوا کے پیچھے وہ تالیاں بجانا

ایسے قافیے اقبال کے ہوتے تو "اودھ پنچ" آسمان سر پر اٹھالیتا۔

عبد السلام ندوی "جوہر عورت" کی ترکیب کو ہدف اعتراض بناتے ہوئے لکھتے ہیں، "کیوں کہ عورت کا لفظ جس معنی میں اردو زبان میں مستعمل ہے، فارسی اور عربی میں مستعمل نہیں، اس لیے اس کی طرف جوہر کی اضافت غلط ہے۔" (اقبالِ کامل، ص ۲۵۰) اس جملے میں "کیوں کہ" غلط ہے۔ "چوں کہ" ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری رقم طراز ہیں، "اقبال کی زبان کے اس بھرپور تجزیے سے یہ امر بخوبی واضح ہو گیا ہے۔۔۔" (اقبال مجدد عصر، ص ۳۶) تیرہ صفحات کے مضمون میں، جہاں انٹ سنٹ باتیں بھی ہیں، بھرپور تجزیہ محل نظر ہے۔ اس جملے میں "بھرپور" حشو ہے۔

(۳۲) جلیل، کوثر اور بے خود جیسے شعرا کے مقابلے میں اقبال کو مستند خیال نہ کرنا ایک المیے سے کم نہیں۔

(۳۳) اقبال، شخصیت اور شاعری، ص ۱۱۹

اقبال کا دوسرا خطبہ
تنقیدی و تحقیقی جائزہ
مذہبی واردات کے انکشافات کی فلسفیانہ پرکھ

پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف اعوان

علامہ اقبال اپنے اس خطبے کا آغاز اثباتِ ذاتِ الٰہی کے حوالے سے یورپی علم الکلام کے تین اہم مکتبہ ہائے فکر پر بحث کرتے ہیں:

۱) کونی، کونیاتی یا تعلیلی تصور: Cosmological Concept

۲) غایتی تصور: Teleological Concept

۳) وجودی تصور: Ontological Concept

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ یہ مکتبہ ہائے فکر اس بات کے غماز ہیں کہ انسانی عقل و فکر نے وجودِ ذات حق کی تلاش و جستجو کے لیے بے انتہا کوشش کی ہے تاہم یہ تینوں مکتبہ ہائے فکر نہ صرف انسانی تجربہ کی سطحیت کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ منطقی پرکھ کی میزان پر بھی پورے نہیں اترتے۔

کونیاتی یا تعلیلی تصور: Cosmological Concept

تعلیلی دبستان فکر کی بنیاد علت و معلول کے باہمی تلازم کا اصول ہے۔ تاہم یہ دبستان علت و معلول کے باہمی تلازم کی مسلسل کڑیوں میں سے کسی ایک کڑی کو منتخب کر کے اور اسے علت اولیٰ کا اعزاز بخش کر خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

بات یہ ہے کہ تعلیلی نقطہ نظر کے مطابق یہ دنیا ایک محدود و یا متناہی معلول (Finite Effect) ہے۔ ظاہر ہے

معلول ہمیشہ علت کے مطابق ہوتا ہے مثلاً آپ جتنی طاقت سے ہوا میں پتھر پھینکیں گے پتھر آپ کی طاقت کے مطابق ہی ہوا میں فاصلہ طے کرے گا گویا طاقت علت اور فاصلہ معلول ہے۔ ظاہر ہے محدود علت محدود معلول پیدا کرے گی اقبال تعلیلی دبستان فکر پر کئی پہلوؤں سے تنقید کرتے ہیں:

(i) اگر تعلیلی نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ دنیا ایک محدود یا متناہی معلول (Finite effect) ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کی علت بھی محدود ہوگی جب کہ اقبال کی نظر میں ذات مطلق کے حوالے سے کسی بھی قسم کی تحدید کا تصور نقصِ ذات کا خیال لاتا ہے جو کہ ناقابلِ قبول ہے۔

(ii) دوسری بات یہ ہے کہ تعلیلی قانون کے مطابق علت و معلول (Cause & Effect) کی کڑیوں کا تسلسل ایک ایسا ناختتام پذیر تعلیلی تسلسل ہے جس کے آخری سرے کا ہاتھ آنا ناقابل فہم اور ناقابل تصور ہے۔ ہر معلول کی کوئی علت اور ہر علت کی کوئی دوسری علت ہوتی ہے اور یوں عللِ کو معلوم کرنے کا سفر ایک ایسا سفر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں اور یہی تعلیلی قانون کی اصل ہے۔ مگر پھر ایسا کیوں ہے کہ تعلیلی دبستان علل کی ناختتام پذیر زنجیر کے تسلسل کو توڑتے ہوئے اس زنجیر کی کسی ایک کڑی پر رک کر اسے یہ اعزاز بخش دے کہ یہ علت ایسی علت ہے جس کی اپنی کوئی علت نہیں اور یہ کہ تمام قسم کے معلول اسی علت کا ثمرہ ہیں۔ اقبال کے نزدیک ایسا کرنا نہ صرف خود قانونِ تعلیل کی تکذیب ہے بلکہ اہل تعلیل کی یہ حرکت خود ان کے تصور کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکتی ہے۔ چناں چہ اقبال فرماتے ہیں:

> To finish the series at a certain pojnt and to elevate one member of the series to the dignty of an uncaused first cause is to set at maught the very law of cousation of which the whole argument proceeds.(1)

(iii) تیسری بات یہ کہ چوں کہ قانونِ تعلیل علت و معلول کے باہم لازمی رشتے پر استوار ہوتا ہے اس لیے ہر علت کا ایک معلول اور ہر معلول کی ایک علت ہوتی ہے۔ گویا علت و معلول ایک دوسرے سے یوں وابستہ ہیں کہ اپنے وجود کے لیے ایک دوسرے کے محتاج نظر آتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ تعلیلی مکتبہ فکر کے ہاں خدا ہستی مطلق ہونے کی بجائے اپنے وجود اور اس کے اثبات کے لیے کائنات کا محتاج ہے۔ جب کہ اقبال بقول غالب اس نقطہ نظر کے حامل ہیں کہ:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا (۲)

(iv) تعلیلی دبستان فکر پر اقبال کا چوتھا اعتراض یہ ہے کہ:

> The argument really tries to reach the infinite by merely negating the finite.(3)

یعنی تعلیلی مکتبہ فکر متناہی (Finite) کی تنقیص سے لامتناہی (Infinite) تک رسائی کی کوشش کرتا ہے اس کا کیا مطلب

ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ قانون تعلیل یہ کہتا ہے کہ لامتناہی (infinite) تک رسائی کا طریقہ یہ ہے کہ ہر قسم کے متناہی معلول (Finite Effect) سے اعراض کرتے ہوئے پیچھے (Regress) ہٹتے چلے جائیں اور یوں متناہی سے مسلسل پسپائی اور پہلو تہی ایک ایسے لامتناہی (Infinite) تک پہنچادے گی جو بذات خود موجود ہو۔ **اقبال** کہتے ہیں کہ تعلیلی مکتبہ فکر کا یہ اندازنہ صرف ٹھوس حقائق سے بیزاری اور رہبانی رویہ کا محرک ہو سکتا ہے بلکہ اس سے یہ تاثر بھی پیدا ہوتا ہے کہ کائنات اور اس کی بوقلمونی کے تمام پہلو گویا اضدادِ الٰہی ہیں۔ اس لیے ان کی تنقیص ہی لامتناہی ذات کی تلاش اور اثبات (Affirmation) کا باعث ہو سکتی ہے۔ اقبال اس نقطہ نظر پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> The infinite reached by contradicting the finite is a false infinite which neither explains itself nor the finite which is thus made to stand in opposition to the infinite.(4)

اگرچہ سازسُر نہیں اور سُر ساز نہیں ہو سکتا البتہ ساز سے سروں کی خلقت چوں کہ ساز کے ہی جوہر باطنی کا اظہار ہے اس لحاظ سے سر اصل ساز کی ہی ذات کا اظہار اور پھیلاؤ ہیں بلکہ انھیں ساز کے رویے اور کردار کی حیثیت حاصل ہے ظاہر ہے رویے کا ذات سے گہرا تعلق ہوتا ہے اور رویے کی تنقیص دراصل ذات کی تنقیص متصور ہوتی ہے۔ چناں چہ اقبال کے خیال میں لامتناہی تک رسائی متناہی سے پہلو تہی کرنے میں نہیں بلکہ متناہی ہی میں "نقش کف پائے یار" دیکھنے میں پوشیدہ ہے۔ بقول اقبال:

> The true infinite does not exclude the finite, it embraces the finite without effacing its finitude and explains and justifes its being.(5)

یوں اقبال وجودِ باری تعالیٰ کے لیے تعلیلی مکتبہ فکر کو مکمل طور پر ناکام قرار دیتے ہیں۔

غایتی تصور: Teleological Concept

تعلیلی تصور یعنی (Cosmological Concept) صرف علت و معلول کی شناخت تک محدود تھا مگر غایتی تصور (Teleological Concept) صرف معلول کی علت معلوم کرنے تک محدود نہیں رہتا مثلاً یہ تصور کائنات میں حکمت، مقصد کی فراوانی اور مظاہر فطرت میں باہمی مطابقت کے مشاہدہ سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ان سب باتوں کے پیچھے جو بھی ہستی بطور علت کارفرما ہے وہ نہایت ہی باشعور، بے پناہ ذہانت کی مالک اور طاقت کی حامل ہے تاہم اقبال اس تصور پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ مکتبہ فکر خدا کو کائنات کے خالق کے طور پر پیش نہیں کرتا بلکہ خدا کو ایک ایسے ماہر کاریگر کی حیثیت دیتا ہے جو خارجی سطح سے ایک صانع یا ناظم کے طور پر پہلے سے ہی موجود ایسی مردہ اور جامد کائنات کا نظام چلا رہا ہے جس کے سرکش عناصر کے اندر اپنی تشکیل اور باہمی تنظیم کی کوئی صلاحیت نہیں۔ اس تصور میں اقبال کے لیے تنقید کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ تصور خدا کو کائنات سے خارج اور علاحدہ

ہستی کے طور پر پیش کر کے اس کی حدود متعین کر دیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ بات انسان اور اس کی صنعت کے حوالے سے یوں تو درست ہے کہ جیسے مٹی الگ ہے اور کمہار کا ہاتھ الگ۔ کمہار خارجی سطح سے مٹی پر کام کر کے اسے پیالہ بنا دیتا ہے۔ اس طرح کمہار اپنی صنعت سے ایک اچھا کاریگر تو ثابت ہو سکتا ہے لیکن مٹی کا خالق نہیں۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اگر غایتی تصور (Teleological Concept) خدا کو بھی انسان کی طرح اپنی صنعت سے الگ اور علاحدہ سمجھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی حیثیت محض ایک کاریگر کی ہے اس کائنات کے خالق کی نہیں یوں خالق کائنات کا سچا تصور پیش کرنے میں یہ مکتبۂ فکر بھی ناکام ثابت ہوتا ہے۔

وجودی تصور: Ontological Concept

اب آیئے (Ontological Concept) یا وجودی تصور کی طرف۔ وجودی تصور یہ خیال پیش کرتا ہے کہ کسی چیز کا تصور ہی اس کے وجود کی دلیل ہے۔ چوں کہ خدا کا تصور ہمارے ذہن میں ہے لہٰذا یہ تصورِ باری تعالیٰ ہی وجودِ باری تعالیٰ پر استدلال کرتا ہے۔ اقبال اس نقطہ نظر پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> The conception of existence is no proof of objective existence.(6)

یعنی محض وجود کا تصور وجود کی معروضی موجودگی کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ تصور تو ہم کسی بھی چیز کا کر سکتے ہیں مثلاً سونے کی چڑیا، سفید کوا یا پروں والے بندر کا تصور، تو کیا ان تصورات سے ایسے جانوروں کا وجود بھی لازم آتا ہے؟ ظاہر ہے یہ حقیقت نہیں ہے۔ اقبال اس تصور کو رد کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> Between the idea of a perfect being in my mind and the objective reality of that being there is a gulf which can not be bridged over by a transcendental act of thought. (P.30)

اس طرح اقبال خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے سلسلے میں یورپی علم الکلام کے تینوں تصورات کو رد کر دیتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کے ہاں وجودِ باری تعالیٰ کے اثبات کا کیا تصور ہے؟

علامہ اقبال کے خیال میں خدا کے وجود کا اصل تصور یورپی علم الکلام کی ناکامی کی وجوہات میں پوشیدہ ہے۔ یورپی علم الکلام کی ناکامی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ فکر اور اشیا کے درمیان ایسی خلیج پیدا کرتا ہے جس سے فکر کی حیثیت اشیا سے الگ محض ایک خارجی کارگر عامل کی ہو کر رہ جاتی ہے جب کہ اقبال کے خیال میں فکر کو اشیا کے اندر اساس اور ان کی تشکیلی اور تخلیقی قوت کی حیثیت حاصل ہے۔ فکر ہی مادہ کی تخلیق کنندہ اور مادی اشیا کی ہستی کی صورت گر ہے۔ کسی بھی شے یا چیز کی تخلیق کا پہلا مرحلہ فکر یا خیال ہے یعنی سب سے پہلے کسی بھی شے کی فکر جنم لیتی ہے اور پھر دوسرے مرحلے پر وہ شے تخلیق ہوتی ہے مثلاً پیالہ بنانے سے پہلے کمہار کے ذہن میں پیالہ کی شکل، اس کا سائز اور خوبصورتی کے دیگر خدوخال جنم لیتے ہیں۔ گویا فکر اور اشیا و حوادث ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں بلکہ

تمام مادی مظاہر فکر کی ہی پیداوار ہیں۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اشیاء و حوادث فکر کا مادی اظہار ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لیے پانی اور برف کی مثال لی جا سکتی ہے۔ برف کی تشکیل و تخلیق میں پانی کو اساسی حیثیت حاصل ہے یعنی پانی سے ہی برف بنتی ہے مگر برف، برف ہی ہوتی ہے، پانی نہیں تاہم برف اور پانی ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں بلکہ ایک ہی ہیں۔ اس لیے کہ برف پانی کا ہی مادی اظہار ہے۔ اسی طرح پیالہ مٹی کی ہی ایک صورت ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم پانی کو برف سے یا مٹی کو پیالہ سے الگ تصور کریں؟ حقیقت یہ ہے کہ بقول غالب:

"اصل شہود و شاہد مشہود ایک ہے" (۸)

تاہم یہ ہمارا انسانی سطح کا تجربہ ہے کہ ہم اشیا کی کنہ تک رسائی نہ ہونے کے باعث فکر کو وجود پر خارج سے وارد کرتے ہیں اور یوں فکر کو وجود سے الگ سمجھتے ہیں حالاں کہ فکر ہی وجود کی اوّل حیثیت اور باطنی حقیقت ہے اور وجودِ فکر کی ظاہری اور مادی صورت ہے کیوں کہ وجود کی تخلیق فکر سے ہوتی ہے جیسے پیالے کی تخلیق مٹی سے ہوتی ہے اسی لیے علامہ اقبال کہتے ہیں کہ فکر اور وجود اساسی طور پر ایک ہیں:

"Thought and being are ultimately one."(9)

اس موقع پر اقبال قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں اور نہایت ہوشیاری اور ذہانت کے ساتھ انسانی تجربے کی ظاہری و باطنی نوعیت کو بنیاد بنا کر مادی کائنات کے اندر خدا کی اول و آخر اور ظاہر و باطن حیثیت کا اثبات اس آئیہ شریفہ کی رو سے کرتے ہیں:

"وہی اوّل ہے وہی آخر وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے۔" (۱۰)

گویا انسانی تجربہ کی کوئی نوعیت ایسی نہیں ہے جو حق تعالیٰ سے ماورا ہو یا حق تعالیٰ اس سے ماورا ہو۔ اقبال کے نزدیک انسانی تجربہ کی تین ظاہری و باطنی سطحیں ہیں۔ مادی، حیاتی اور نفسیاتی۔ ان تینوں کا تعلق بالترتیب تین علوم فزکس، بیالوجی، اور نفسیات سے ہے۔

مادہ:

سب سے پہلے اقبال مادہ کی ماہیت سے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ جدید فزکس کے مطابق مادہ پیکر محسوس کا نام ہے یعنی مادہ کا تعلق تجرباتی حقائق یا حسی تجربہ کے ساتھ ہے۔ ماہرین طبیعیات کے تمام نظریات اوّل و آخر حسی تجربہ سے ہی تعلق رکھتے اور اسی معیار پر پرکھے جاتے ہیں۔ گویا فزکس کا تعلق ایسی مادی دنیا کے ساتھ ہے جس کا اظہار حواس سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کا تجربہ خواہ اس کا تعلق ذہنی عوامل کے ساتھ ہو یا جمالیاتی اور مذہبی امور سے، علم طبیعیات کی بحث سے باہر ہے۔ تاہم بقول اقبال اگر کسی ماہر طبیعیات سے یہ پوچھا جائے کہ آپ مادی دنیا میں کن کن چیزوں کا ادراک کرتے ہیں تو وہ جواب میں یقیناً کئی چیزوں کا نام لے سکتا ہے مثلاً زمین، آسمان، پہاڑ، میز اور کرسی وغیرہ پھر اگر اسے مزید پوچھا جائے کہ آپ صحیح صحیح بتائیں کہ آپ ان اشیا میں کس چیز کا ادراک کرتے ہیں کہ میز کو تو آپ میز کہتے ہیں اور کرسی کو کرسی علیٰ ہذا القیاس جواب ہو گا ان کی صفات۔ اقبال

کہتے ہیں کہ اس جواب سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کسی بھی شے کا تصور حواس کی بخشی ہوئی معلومات اور ان کی توجیہہ کرنے والے ذہنی عمل سے ہی تکمیل پاتا ہے مثلاً ہماری آنکھ ایک مظہر (Phenomenon) کو ایک خاص ڈھنگ کا دیکھتی ہے لیکن یہ نہیں بتاتی کہ وہ کیا شے ہے اس کے لیے وہ مظہر (Phenomenon) ایک ایسے ذہنی عمل کا محتاج ہے جو نہ صرف اس مظہر کی صفات کا واضح ادراک رکھتا ہے اور اس کا تصور اس کی صفات کے مطابق قائم کرتا ہے بلکہ تفہیم صفات کے اس ذہنی ادراکی عمل سے پیکر مادی کی ہستی کا اثبات بھی ممکن بنتا ہے۔ تاہم مادی فکر حواس کے لیے غیر مدرک اس ذہنی عمل کو نہیں مانتی جس سے کسی پیکر مادی کی ہستی کا اثبات ہوتا ہے اور نہ ہی مادی اشیا کی صفات کو، کیوں کہ یہ نہ ناپی تولی جاسکتی ہیں، نہ چکھی اور چھوئی جاسکتی ہیں اور نہ ہی دیکھی اور سونگھی جاسکتی ہیں۔ پھر کیا یہ ممکن ہے کہ ماہرین طبیعیات مادی اشیا سے ان کی صفات جن کی ماہیت بقول ان کے مادی نہیں علاحدہ کر سکیں۔ جواب یقیناً نفی میں ہوگا کیوں کہ اشیا کی پہچان ان کی صفات سے ہی ممکن ہے اور صفات کا ظاہری حواس ادراک کرنے سے قاصر ہیں۔ چناں چہ کسی بھی مظہر کی صفات اور ان کی پرکھ کرنے والے ذہنی عمل کو مادی دنیا سے علاحدہ تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یوں علم طبیعیات کا یہ دعویٰ کہ اس کا تعلق فقط علم مادی سے ہے غلط ثابت ہوتا ہے۔

اقبال نے مادیت کے روایتی تصور پر تنقید کے حوالے سے برکلے (۱۲ مارچ ۱۶۸۵ء تا جنوری ۱۷۵۳ء) اور پروفیسر وائٹ ہیڈ (۱۸۶۱ء تا ۱۹۴۷ء) کے نظریات کو بھی پیش کیا ہے۔ ان مفکرین کے خیال میں بھی اشیا صرف جسم ہی نہیں بلکہ اپنی صفات اور خصوصیات بھی رکھتی ہیں مثلاً پروفیسر وائٹ ہیڈ کہتے ہیں کہ ہماری آنکھوں یا کانوں میں رنگ یا آواز داخل نہیں ہوتی بلکہ ایتھر (Either) کی ناقابل دید اور ناقابل شنید لہریں داخل ہوتی ہیں اور پھر یہ ہمارا ذہنی عمل ہے جو ان لہروں کا ادراک کرتا ہے اور دید وشنید کی مختلف صورتوں کو محسوس کرتا ہے گویا مادی مظاہر ذہن کے ادراکی عمل کے بغیر کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ایک سوئے ہوئے، بے ہوش یا مرے ہوئے انسان کے کان کھلے ہوئے ہوتے ہیں اور آنکھیں بھی اگر چہ کھلی ہوئی ہی کیوں نہ ہوں تاہم اگر اس کے سامنے رنگ رنگ کے نظارے لائے جائیں یا سُر اور ساز کی کیسی ہی جوت جگائیں مگر ذہن پر رنگ وصوت کا کوئی تاثر پیدا نہیں ہوگا۔ اس کے لیے رنگ وصوت کی کوئی ہستی ہی نہیں ہے کیونکہ اس کا ان چیزوں کو ادراک کرنے والا ذہنی عمل رکا ہوا ہوتا ہے۔

اس کے بعد علامہ اقبال اپنے خطبہ میں آئن سٹائن (۱۴ مارچ ۱۸۷۹ء تا ۱۸ اپریل ۱۹۵۵ء) کا ذکر کرتے ہیں۔ مادہ کے روایتی تصور کو سب سے کاری ضرب آئین اسٹائن کے ہاتھوں لگی۔ مادہ کے قدیم یا روایتی تصور میں دو باتیں سب سے اہم ہیں:

(۱) مادہ کی قدیم، مستقل، قائم بالذات اور جامد و بے روح حیثیت۔

(۲) مکاں کی معروضی اور مطلق حیثیت۔

مکاں کی معروضی اور مطلق حیثیت کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ مکاں موجود ہے اور اس کی حدود متعین ہیں جن میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ کہ مادہ اور مکاں کا باہمی تعلق ایسے ہی ہے کہ جیسے کوئی صندوق اور اس میں پڑے ہوئے کپڑے۔

آئن اسٹائن نے قدیم تصور مادہ کے ان دونوں پہلوؤں کو رد کر دیا اور اس نے کہا کہ تمام مادی مظاہر ایک باہمی مربوط نظام میں

وابستہ مختلف کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کوئی بھی مادی مظہر کائنات میں اس طرح الگ تھلگ واقع نہیں کہ اسے قائم بالذات ہونے کی حیثیت حاصل ہو۔ کائنات بقول وائٹ ہیڈ ایک ایسا عضویہ نامیہ (Organic Whole) ہے، جس میں واقع کوئی بھی مظہر جامد و بے روح نہیں۔ کائنات ایک زندہ جاوید حقیقت ہے اور زندگی تخلیقیت سے عبارت ہے چنانچہ مادہ مسلسل تخلیقی رو کا حامل ایسے مربوط (Inter- related) واقعات کا نام ہے جس کے اندر فروغ وارتقا کی دائمی لگن ہے اور فروغ وارتقا کے اس عمل میں کسی چیز کو مستقل حیثیت حاصل نہیں۔

زندگی قطرے کو سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا(۱۱)

قدیم تصور مادہ کا دوسرا پہلو مکاں کی معروضی اور مطلق حیثیت ہے۔ آئن اسٹائن یہ کہتا ہے کہ مکاں اگرچہ حقیقی ہے تاہم مشاہد کی نسبت سے اس کی ہستی اضافی ہے۔ اقبال آئن اسٹائن کے تصور مکاں کو یوں پیش کرتے ہیں:

> "The object observed is variable, it is relative to the observer; its mass shape and size change as the observer's position and speed change. Movement and rest too are relative to the observer.(12)

گویا کسی بھی شے کی حقیقت اس کے مشاہدہ کرنے والے کی حالت سے متعین ہوتی ہے۔ بس کے اندر بیٹھے ہوئے مسافر اپنے آپ کو ساکن تصور کرتے ہیں جب کہ بس سے باہر مشاہدہ کرنے والا ان مسافروں کو حرکت میں دیکھتا ہے۔ میں اس موقع پر سی۔ای۔ایم جوڈ کی کتاب "Guide to Philosophy" سے اپنی بات کی وضاحت کے لیے مدد لوں گا۔ C.E.M.Jode اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ایک ننھے سے کیڑے کو تو اپنی ٹانگ بہت بڑی دکھائی دیتی ہے لیکن ہمیں وہ بہت چھوٹی نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ جوڈ لکھتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ:

> "Size is not an intrinsic quality of the object seen, a quality possessed by it in its own right but is relative to and dependent upon the nature of the perceiver's mind"(13)

ایک سو فٹ اونچے کھمبے کی لمبائی سو فٹ دور کھڑے ہو کر مشاہدہ کرنے والے کے لیے کچھ اور ہو گی، پچاس فٹ دور کھڑے مشاہد کے لیے اور ہو گی اور جو شخص عین کھمبے کے نیچے سے آنکھیں اوپر اٹھا کر کھمبے کی اونچائی کا مشاہدہ کرے گا اسے وہ کھمبا فلک بوس دکھائی دے گا۔ کس کی بات مانی جائے اور کس کی بات نہ مانی جائے؟ درحقیقت ہر مشاہد اپنے حساب سے اپنے مشاہدہ میں درست ہے، لیکن اقبال کہتے ہیں کہ

> "Personally, I believe that the ultimate character of reality is spiritual" (14)

"نہ ہے زماں، نہ مکاں، لاالہ الااللہ" (۱۵)

گویا حقیقت کا بنیادی کردار روحانی ہے تاہم اقبال کی نظر میں آئن اسٹائن کے نظریہ مکاں میں خوبی کے دو اہم پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ آئن اسٹائن قدیم یونانی مفکر زینو (Zeno) کے برعکس مکاں کے معروضی اور حقیقی ہونے کا قائل ہے اور دوسری خوبی یہ ہے کہ آئن اسٹائن نے مکاں کی مطلقیت کے تصور کو رد کر کے مکاں کا انحصار مادہ کی کمیت کو قرار دیا کیونکہ آئن اسٹائن کے نزدیک مادہ جامد و بے روح نہیں بلکہ اس میں کمی بیشی ممکن ہے اور مکاں کی حدود کا انحصار بھی مادہ کی اسی کمی بیشی پر ہے۔ گویا مادہ کی افزائش مکاں کی حدود میں افزائش اور مادہ میں کمی مکاں کی حدود کے سکڑنے کا باعث ہو سکتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر مادہ نہ ہو تو کائنات سمٹ کر ایک نقطے میں بھی مرکوز ہو سکتی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں:

> "In the absence of matter the universe would shrink to a point"(16)

ماہرین طبیعیات کے مادی تصورات پر تنقید و تبصرہ کے بعد علامہ اقبال حیات و شعور کی نوعیت و ماہیت پر بحث کرتے ہیں مگر انہیں اس بات پر افسوس ہے کہ مادی طرز فکر حیات و شعور کی غیر مادی سطح کو بھی مادی اور میکانکی قوانین کا اسیر سمجھتی ہے۔ اس کے نزدیک زندگی شعور، احساس اور ارادہ ہر چیز کو میکانکی قوانین کی روشنی میں دیکھا، پرکھا اور بیان کیا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال معترف ہیں کہ سائنسی علم ایک نہایت قابل اعتبار علم ہے اور یہ کہ سائنس مظاہر فطرت کے حوالے سے قابل قدر معلومات فراہم کرتی ہے تاہم سائنس کے لیے مادہ اور حیات و شعور کے درمیان بدیہی فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔ اگر سائنس حیات و شعور جیسی غیر مادی سطحوں کو بھی میکانکی قوانین کی قلمرو میں داخل سمجھتی ہے تو کیا میکانکی قوانین کی حکمرانی کی دعویدار سائنس کے پاس مادہ، حیات اور شعور کے باہمی ربط و تعلق کے حوالے سے کوئی ایسا واحد منظم علم ہے جس سے مکمل حقیقت کا ادراک ممکن ہو سکے۔ اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب سائنس کے پاس نہیں ہے اس لیے کہ مختلف سائنسی علوم اپنے اپنے دائرہ میں محدود ہیں اور ضروری نہیں کہ ان کی تحقیقات بھی ایک دوسرے سے مناسبت اور مطابقت رکھتی ہوں۔ گویا تمام سائنسی علوم مظاہر فطرت کو اپنے اپنے انداز میں دیکھتے، پرکھتے اور نتائج مرتب کرتے ہیں۔ چنانچہ ان سائنسی علوم کی مثال بقول اقبال ایسے بہت سے گدھوں کی سی ہے جو نیچر کو ایک لاش سمجھ کر اس کے مختلف حصوں کو نوچ رہی ہیں۔ اقبال کے الفاظ میں:

> "In fact the various natural sciences are like so many vultures falling on the dead body of nature and running away with a piece of its flesh"(17)

علامہ اقبال کے خیال میں حیات پر مادی اور میکانکی قوانین اور اصولوں کو اس لیے بھی لاگو نہیں کیا جا سکتا کہ مادی اور میکانکی طرز عمل علت و معلول (Cause & Effect) کے متعین قوانین کا پابند ہوتا ہے جب کہ حیات اپنے ارتقائی بہاؤ میں کسی قسم کے تعینات کی پابند نہیں۔ یہ ایک ایسی آزاد اور سیلانی رو ہے جس کے اندر مختلف مراحل میں جو تبدیلیاں بھی رونما ہوتی ہیں وہ اس کی اپنی

آغوش سے ابھرنے والے مقاصد سے جنم لیتی ہیں اور اس پر کوئی خارجی میکانکی جبریت عمل پیرا نہیں ہوتی۔ گویا زندہ اور باشعور عضویہ کی حرکت کا باعث خارجی سطح کا حامل میکانکی تعلیلی قانون نہیں بلکہ ایسے مقاصد کی لگن ہے جن کی نوعیت داخلی اور موضوعی ہے۔

علامہ اقبال اپنے خیال کی تائید میں مشہور زمانہ ماہرین حیاتیات جے۔ ایس۔ ہالڈین اور ڈریش کے نظریات کو پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ زندگی ایک ایسی کلیت ہے جو وحدت کا رنگ رکھنے کے باوجود کثرت کا شکار ہے۔ وحدت حیات میں کثرت کی جلوہ آرائی دراصل اس کے ارتقائی سلسلہ (Career) کے وہ مراحل ہیں جن سے گزرتے ہوئے زندگی حیات انسانی کے اعلیٰ وارفع مقام تک پہنچتی ہے۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے برقی رو کی مثال نہایت معاون ہو سکتی ہے۔ کسی تار پر برقی رو کا تسلسل چاہے کتنے ہی دور دراز فاصلے پر کیوں نہ پھیلا ہوا ہو اور اس پر چاہے چھوٹے بڑے کتنے ہی قمقمے کیوں نہ روشن ہوں سب ایک ہی برقی رو کی کلیت کے تسلسل کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح آغاز سے اب تک زندگی کی برقی رو سے روشن حیات کی جتنی بھی صورواشکال ہمارے سامنے ہیں اگرچہ ان میں بے انتہا بوقلمونی ہے تاہم وہ حیات کی وحدت اور کلیت کے مختلف مراحل کے نشانات ہیں۔

اقبال فرماتے ہیں کہ مشینی اور میکانکی طرز عمل کے برعکس زندگی جب مقاصد کو اپنی آغوش میں تھامے ہوئے آگے قدم رکھتی ہے اور ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے تو یا تو یہ بالکل نیا طرز عمل اور تازہ اسلوب اختیار کر لیتی ہے یا پھر پرانے طرز عمل کے اندر تبدیلیاں لے کر آتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حیات اپنے ارتقائی بہاؤ میں ایک ایسے تسلسل عمل کی حامل ہے جس کا تعلق ماضی سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی بقول اقبال:

"It possesses a career".(18)

چنانچہ حیات کی حالیہ سرگرمیوں کا تعلق ایک ایسے دور دراز ماضی کے ساتھ وابستہ ہے جس کا سرچشمہ روحانی حقیقت میں مضمر ہے۔ اگر آج بھی کسی میں ابراہیم کا ایمان پیدا ہو جائے تو یہ روحانی حقیقت حیات کی تہوں میں موجود ہونے کے باوصف کسی پر بھی کسی بھی وقت منکشف ہو سکتی ہے۔ تاہم چونکہ اس کی نوعیت مادی نہیں، اس لیے اس کا کوئی میکانکی تجزیہ بھی ممکن نہیں۔ اقبال فرماتے ہیں کہ چونکہ حیات کی ہر سرگرمی ماقبل سرگرمی سے وابستہ ہے اس لیے طبیعی اور کیمیائی عوامل کے مقابلے میں بھی حیات کو اساسی اور متقدم حیثیت حاصل ہے اور اس لحاظ سے میکانکی قوانین حیات کی سابقہ ارتقائی سرگرمیوں کے ایک مرحلہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اس مرحلہ پر اقبال کی فکر و نظر کا رخ زماں (Time) کی طرف مڑ جاتا ہے اور اب زندگی کی بنیادی اور اساسی حیثیت کو زماں کے حوالے سے پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کائنات اور مظاہر فطرت و قدرت کا تعلق زمانے کے ساتھ وابستہ ہے۔ قرآن مجید کی کئی ایک آیات اس پر حجت ہیں۔ مثلاً:

سورہ یونس آیت نمبر ۶:

"یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور ہر اس چیز میں جو اللہ نے زمین اور آسمانوں میں پیدا کی ہے، نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو بچنا چاہتے ہیں"۔ (۱۹)

اور پھر سورہ لقمان آیت نمبر ۲۹ میں ارشاد ہوتا ہے:

''اور کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں۔ اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ سب ایک وقتِ مقررہ تک چلے جا رہے ہیں''۔(۲۰)

یہ ٹھیک ہے کہ کائنات اور مظاہر قدرت و فطرت کا تعلق زمانے کے ساتھ وابستہ ہے لیکن چونکہ مظاہر قدرت و فطرت ہم سے خارجی سطح پر واقع ہیں اس لیے ان کے وجود کی حقیقت پر شک کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ کسی چیز کے قائم بالزماں ہونے کے معنی و مفہوم کی تفہیم اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم اپنے شعوری تجربے کا تجزیہ نہ کریں کیوں کہ شعوری تجربے کی حیثیت ہی داخلی اور موضوعی ہے۔ شعوری تجربے کے تجزیے سے وجود کی اصلیت واضح ہو جاتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ وجود جامد و ساکت نہیں بلکہ ہماری ہستی یا نفس میں پل پل تغیرات اور تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ بقول برگساں مجھے اپنے شعوری تجربے سے احساس ہوتا ہے کہ میں ہر لحظہ ایک حالت سے دوسری حالت میں داخل ہوتا رہتا ہوں مجھے کبھی گرمی لگتی ہے، کبھی سردی، کبھی خوش ہوتا ہوں، کبھی اداس، کبھی کچھ سوچتا ہوں، کبھی کچھ دیکھتا ہوں، کبھی کچھ کرتا ہوں اور کبھی کچھ نہیں کرتا۔ گویا احساسات، محسوسات، ارادے، خیالات، یہ وہ تبدیلیاں ہیں جن میں میری ہستی منقسم ہے:

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود(۲۱)

گویا باطنی ہستی میں سکون و قرار نہیں بلکہ حالتوں کے تبدیل ہونے کا ایک ایسا مسلسل بہاؤ ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ اس صورت حال سے اقبال ایک منطقی نتیجہ یہ اخذ کرتے ہیں:

"Constant change however is unthinkable without time"(22)

یعنی وقت کے بغیر تبدیلی کا عمل ناقابل تصور ہے۔ گویا ہمارا شعوری تجربہ اور اس کا تجزیہ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ ہماری ہستی یا حیات بے زماں نہیں بلکہ اس کا قیام اور بقا فی الزماں ہے۔

اس کے بعد اقبال کہتے ہیں کہ شعوری تجربہ کا بغور جائزہ ذات کے دو پہلوؤں کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتا ہے۔

(۱) قدری پہلو (Appreciative Self)

(۲) فاعلی پہلو (Efficient Self)

شعوری تجزیے سے یہ معلوم ہوا تھا کہ ہماری ذات میں احساسات، ارادوں اور خیالات ایک تلاطم ہے۔ ظاہر ہے ذات ان ارادوں اور خیالات کو عملی صورت میں پورا بھی کرنا چاہتی ہے۔ اقبال کے خیال میں ذات کا فاعلی پہلو یہ فریضہ انجام دیتا ہے اور قدری ذات کے ارادوں، خیالات اور مقاصد کو خارجی سطح پر عملی صورت فراہم کرتا ہے۔ گویا فاعلی ذات کا تعلق خارجی کردار کے ساتھ ہے۔ ہم جو کچھ بھی دنیا میں کرتے ہیں، اچھا کرتے ہیں یا برا کرتے ہیں، اس کا تعلق ذات کے خارجی فاعلی رخ کے ساتھ ہے۔ فاعلی

ذات کے اعمال ایک تواتر اور ترتیب کے حامل ہوتے ہیں اور نفس کی مختلف کیفیتوں کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ فاعلی ذات کے لیے زماں کی حقیقت مکاں میں ایک ایسی سیدھی لکیر کی سی ہے۔ جس پر واقعات ایسے مختلف مکانی نقاط کی حیثیت رکھتے ہیں جنھیں علیحدہ علیحدہ دیکھا اور پرکھا بھی جاسکتا ہے مگر برگساں کے نزدیک وقت کا یہ تصور حقیقی نہیں کیوں کہ وقت کا یہ تصور زندگی اور اس کے تمام اعمال کو محض ایک دھوکا بنا کر رکھ دیتا ہے۔ چنانچہ اب اقبال کی فکر کا رخ ذات کے قدری پہلو کی طرف مڑتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ ذات کے فاعلی رخ کے شدت کے ساتھ زمان و مکاں کی خارجی سطح کے ساتھ وابستہ ہو جانے اور دنیاوی امور میں کھو جانے کے باعث اکثر ذات کا داخلی پہلو یعنی قدری پہلو جسے نفس حق شناس بھی کہا جاسکتا ہے، ہماری نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ تاہم بعض اوقات گہرے تفکر یا مراقبے کی حالت میں ایسے لمحات آجاتے ہیں کہ جب ہماری فاعلی ذات غیر مستعد ہو جاتی ہے اور ہم اپنی ذات کی گہرائیوں میں ڈوب کر تجربے کے باطنی مرکز یعنی ذات کے قدری پہلو تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔

خودی یا نفس کی اس گہری سطح پر شعور کی مختلف حالتیں ایک دوسرے میں اس طرح ضم ہوئی دکھائی دیتی ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ تصور نہیں کیا جاسکتا۔ گویا ذات کا قدری رخ ایک ایسی کلیت ہے جس میں حرکت اور تبدیلی تو ہے مگر اس میں بدلتی ہوئی حالتوں کی کوئی شماریاتی تقسیم ممکن نہیں۔ یہاں عناصر کی کثرت کی حیثیت فاعلی ذات کے برعکس نہ عددی ہے اور نہ کسی ترتیب کی حامل بلکہ کلیتاً معیاری۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ قدری ذات میں زماں کی حیثیت ایک ایسی آنِ واحد کی ہے جس میں ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی تخصیص نہیں۔ یہ ایک ایسا دورانِ خالص ہے جسے ایک نامیاتی کل (Organic Whole) کی حیثیت حاصل ہے اور جو مکاں کی ظاہری حدبندیوں کا شکار نہیں۔

ہمارے لیے زمانِ خالص یا دورانِ خالص یعنی (Pure Time) کے تصور کی تفہیم اس لیے کسی قدر مشکل ہے کہ ہم عموماً وقت یا زماں کے جس خارجی اور مکانی تصور سے متعارف ہیں اس کو ہم سیکنڈوں، منٹوں، گھنٹوں، دنوں، مہینوں اور برسوں کی مختلف اکائیوں میں منقسم سمجھتے ہیں اور یوں ماضی، حال اور مستقبل کا تصور رکھتے ہیں۔ جب کہ شعوری تجربے میں موجود دورانِ خالص ایک نامیاتی کُل ہے۔ دوران خالص کے نامیاتی کل ہونے سے مراد یہ ہے کہ دوران خالص (Pure Time) میں وقت لمحات یا دیگر اس نوع کی اکائیوں میں منقسم نہیں ہوتا اور اس لحاظ سے وقت کی ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کے تصور کا اطلاق بھی دوران خالص پر نہیں ہوتا۔ چنانچہ دوران خالص میں ''آنِ واحد'' میں انجام پانے والے بہت سے امور ایسے ہوسکتے ہیں کہ جو اگر مکانی یا خارجی زماں میں برسر عمل آئیں تو شاید ماضی و حال اور مستقبل کے طویل عرصے کو محیط ہو جائیں۔ مثلاً خواب کی حالت میں جب انسان گہرے شعوری تجربے میں ڈوب کر اور خارجی زماں کی حدبندیوں سے نکل کر دورانِ خالص میں قدم رکھتا ہے تو وقت کے متعلق اس کے تجربے کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ کیوں کہ خواب کی حالت میں لمبے لمبے سفر طے کرنے، کسی دور دراز مقام سے ہو کر واپس آجانے یا کسی بڑے سے بڑے کام کو انجام دینے میں وقت کے صرف ہونے یا گزرنے کا احساس نہیں ہوتا۔

دورانِ خالص کے ذکر کے ساتھ ہی اقبال زماں کی تخلیقی حیثیت کو زیر بحث لے آتے ہیں۔ اقبال کے خیال میں زماں ہر لحظہ

نئے حوادث وواقعات کی تخلیق کا کام انجام دیتا ہے۔ گویا اقبال کی نظر میں زماں تخلیق کنندہ ہے اور یہ تخلیقی عمل لحظہ بہ لحظہ اور دمبدم آگے بڑھتا ہے:

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات (۲۳)
سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات (۲۴)

اقبال کے خیال میں وقت ایک ایسی لکیر نہیں جو کھچی جاچکی ہو بلکہ وقت ایک ارتقائی تسلسل ہے جس کے بطن سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں۔ اقبال اپنے خطبے میں رقم طراز ہیں:

"Every moment in the life of reality is original giving birth to what is absolutey novel and unforeseable. Everyday doth some new work employ him, says the Quran".(25)

اقبال کہتے ہیں کہ دورانِ خالص میں وقت ماضی، حال اور مستقبل کے الگ الگ خانوں میں منقسم نہیں ہوتا بلکہ شعوری تجربے کی سطح پر یہ تینوں پہلو باہم پیوست و یکجا ہوتے ہیں۔ ماضی حال میں مدغم ہوتا اور حال ماضی سے آنکھیں ملاتا ہوا مستقبل کی تخلیق کا کام انجام دیتا ہے تاہم یہ یاد رہے کہ مستقبل کسی متعین واردات (fixed Event) کے طور پر زمانِ خالص کا حصہ نہیں ہوتا بلکہ ماضی و حال کا شعوری ارتقا مستقبل کے کئی ایک امکانات میں سے ردو انتخاب کے ذریعے کسی ایک امکان کی تخلیقی تعبیر کا بیڑہ اٹھاتا ہے۔ اس طرح زماں (Time) اقبال کے ہاں ایک تخلیق کار عامل کے طور پر نمایاں ہوتا ہے۔

زماں کے تخلیقی پہلو کی بحث اب تقدیر کے مسئلے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

علامہ اقبال نے اگرچہ اپنے اس خطبے میں آئن اسٹائن کے تصور اضافیت (Theory of Relativity) کی خوب تعریف کی ہے تاہم اس کے تصور زماں کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ آئین اسٹائن کا خیال یہ ہے کہ زماں و مکاں کا چوتھا بعد (Fourth dimension) ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ زماں مکاں کے ساتھ پہلے سے وابستہ ایک متعین حقیقت ہے۔ اگر زماں متعین حقیقت ہے اور پہلے سے موجود ہے تو گیاں زماں واقعات سے خالی ایک ایسا ظرف ہوگا جس میں واقعات و حوادث کا جام بعد میں بھر اجائے گا۔ ظاہر ہے کہ وقت کا تصور واقعہ کے بغیر ممکن نہیں۔ چاہے واقعہ معمولی ہو یا غیر معمولی۔ اگر بقول آئن اسٹائن وقت پہلے سے مکاں کے چوتھے بعد کی حیثیت سے ایک متعین حقیقت ہے تو ظاہر ہے اس کے اندر حوادث وواقعات بھی پہلے سے متعین ہوں گے جو کہ کوئی نئی بات نہ ہوں گے تاہم ایک ایک کر کے ظاہر ہوتے جائیں گے جیسے ویڈیو کیسٹ میں متعین وقت کے ساتھ واقعات و حوادث کا ایک مکمل پروگرام پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے اور جب کیسٹ چلتی ہے تو پہلے سے متعین وقت کا پہیہ بھی چلتا ہے اور اپنے ساتھ ریکارڈ واقعات کو بھی ظاہر کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ ایک میکانزم ہے۔ جس میں نہ وقت کچھ کر سکتا ہے اور نہ واقعات و حوادث ادھر ادھر

ہو سکتے ہیں۔ تقدیر کے نقطہ نظر میں بھی کچھ اسی طرح کا تصور ہے کہ جو کچھ ہونا ہے، ہو کر رہے گا۔ جو مقدر میں لکھا ہے مل جائے گا۔ اس تصور سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسان قدرت کے ہاتھوں میں ایک تماشا بنا ہوا ہے۔ اقبال یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا تقدیر کا یہ تصور نائب حق حضرت انسان کے شایان شان ہے؟ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ وقت کے ایسے تصور سے تقدیر کا ایک ایسا بھیانک تصور جنم لیتا ہے جو افراد کے قوائے عملیہ کو مفلوج کر کے رکھ سکتا ہے۔ اقبال زماں اور تقدیر کے حوالے سے اپنے خطبہ میں لکھتے ہیں:

"It is time regarded as an organic whole that the Quran describes as "Taqdir" or the destiny.(26)

گویا قرآن زماں کو بحیثیت "نامیاتی کل" تقدیر قرار دیتا ہے اور جیسے کہ میں نے پہلے وضاحت کی ہے کہ وقت کے نامیاتی کل ہونے سے مراد دوران خالص (Pure Time) کا وہ تصور ہے جس میں کسی متعین مستقبل کا کوئی تصور نہیں۔ اقبال خطبہ میں زماں اور تقدیر کے باہمی تعلق کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Destiny is time regarded as prior to the disclosure of its possibilities."(27)

گویا تقدیر وہ وقت ہے جو اپنے ظہور سے قبل امکاں کے طور پر دیکھا جائے بقول اقبال وقت کے تخلیق کنندہ ہونے کی حیثیت سے وقت کا کسی واقعے کی تخلیق کے بغیر تصور ناممکن ہے مگر یہ کہ وقت سے کیا واقعہ تخلیق ہوتا ہے اسے پہلے سے متعین فرض نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ نوعیتِ واقعہ کے لحاظ سے ہمیشہ بے شمار امکانات ہوتے ہیں جو ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔ ان امکانات میں سے کسی ایک امکان کے امر واقعہ بننے کا انحصار کس بات پر ہے اس کی میں ایک مثال سے وضاحت کرنا چاہوں گا۔ ایک طالب علم جب امتحان کی تیاری کرتا ہے تو اس کے سامنے کامیابی اور ناکامی کی مختلف سطحوں کو پانے کے لا تعداد امکانات اس کی تقدیر کی صورت اس کے سامنے ہوتے ہیں تاہم ان امکانات میں سے کون سا امکان یا یوں کہہ لیجیے کہ تقدیر کی کون سی صورت وقت کی آغوش سے امر واقعہ کا روپ دھارتی ہے اس کا انحصار طالب علم کی اپنی محنت، کوشش، لگن، جدوجہد اور صلاحیتوں کے استعمال کے معیار پر ہے۔ اقبال قرآن کے حوالے سے اپنے خطبہ میں رقم طراز ہیں کہ:

"اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو پیدا کیا اور ہر ایک کو اس کی تقدیر بھی تفویض کر دی"

"وخلق کل شیء فقدرہ تقدیرا" (۲۸)

ظاہر ہے یہاں بھی تقدیر تفویض کر دینے سے مراد کسی چیز کے فروغ وارتقا اور نشوونما پانے یا نہ پانے کے امکانات ہیں۔ موج جب تک دریا میں رہتی ہے بپھر کر طوفان بن سکتی ہے لیکن بیرون دریا اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

علامہ اقبال کے نزدیک تقدیر سے مراد کسی ظالم آقا کا ایسا بے رحم ہاتھ نہیں جو خارجی سطح سے کسی شے کو مخصوص اور متعین حالات و واقعات کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر رہا ہو بلکہ ہر شے کے ساتھ غنچہ سے گل اور گل سے گلستاں ہونے کے لاتعداد قابل حصول امکانات مختلف تقدیرات کی صورت میں منسلک کر دیئے گئے ہیں تاہم ان میں سے کسی ایک امکان یا تقدیر کے

حصول کا معاملا کسی شے کی اپنی باطنی رسائی یعنی اندرونی صلاحیتوں کے استعمال اور معیارِ اہلیت کے ساتھ وابستہ ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس سے کسی شے کے معیارِ زندگی اور شعورِ حیات کی سطح کا اندازہ ہوتا ہے۔

بہر حال حضرت علامہ اقبال حیات کو علت معلول کی میکانکی پابندیوں سے آزادی اور جدت و اختراع کا حامل ایسا بے مثل جوہر سمجھتے ہیں جس میں انتخاب کرنے، رد کرنے، غور و فکر کرنے، ماضی و حال کا جائزہ لینے اور حرکی وار تقائی انداز میں مستقبل کو اپنے تصور سے تخلیق کرنے کی صلاحیت ہے جب کہ میکانکیت کی دنیا عمل کی ایسی آزادی سے محروم ہے:

ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے
وہ عالم مجبور ہے، تو عالم آزاد (۲۹)

اقبال فرماتے ہیں کہ حیات اپنے ارتقائی مراحل میں مختلف امکانات کو تسخیر کرتی ہوئی تجربہ و شعور کے جن مراحل سے گزرتی ہے انھیں اپنے اندر جذب کرتی ہوئی اور سمیٹتی ہوئی آگے بڑھتی ہے تاہم حیات کا یہ تحرک مقصد کی لگن کے بغیر ممکن نہیں کیوں کہ اقبال کی نظر میں مقصد زندگی کے لیے Forward look اور Forward Push کا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں سے اقبال اور ہنری برگساں (۱۸ اکتوبر ۱۸۵۹ء تا ۴ جنوری ۱۹۴۱ء) کے اختلافات ابھرتے ہیں۔ برگساں حرکت کو زندگی کی خصوصیت قرار دیتا ہے تاہم برگساں کے خیال میں زندگی کے اندر حرکت کا باعث کوئی مقصد نہیں بلکہ محض جوشِ حیات (Elan Vital) ہے۔ دراصل برگساں کا اعتراض یہ ہے کہ اگر حرکت حیات میں متعین مقاصد سے متعین مستقبل تک رسائی کے نقطۂ نظر کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ حرکت ایک تخلیقی عمل کی بجائے میکانکی سرگرمی بن جائے گی اور اس طرح زماں کی حقیقت بھی بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ علامہ اقبال اس اعتراض کا ایک جواب تو یہ دیتے ہیں کہ وقت کوئی پہلے سے کھینچی ہوئی لکیر نہیں جس پر چل کر میکانکی انداز کے ساتھ مقاصد کو حاصل کیا جا سکے اور دوسری بات یہ کہ مقصد کے تصور سے یہ مراد لینا کہ مقاصد ایسے بندھے ٹکے، اس طرح سے متعین اور ایک خاص زمانی فاصلے پر موجود وہ اہداف ہیں جن تک رسائی مخصوص مراحل سے گزر کر ہونا پہلے سے ایک دیکھی بھالی ہوئی حقیقت اور طے شدہ امر ہے، درست نہیں۔ کیوں کہ اس طرح مقصدی حرکت بلا شبہ ایک میکانکی عمل بن جاتی ہے۔ جب کہ اقبال خطبہ میں فرماتے ہیں کہ مقصد شعور کا ایک ایسا باطنی تخلیقی عمل ہے جو خودی کو دعوتِ مبارزت دیتا ہے اور مستقبل میں اس کا حصول اس لحاظ سے محض ایک امکان ہوتا ہے کہ اس تک رسائی خودی کی اندرونی قوت تخلیق اور اختراعی صلاحیت اور جذبہ کدوکاوش کے ساتھ مشروط ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک برگساں کی اصلی غلطی یہ ہے کہ وہ زمانِ خالص (Pure Time) کو ذات سے الگ اور مقدم سمجھتا ہے حالاں کہ دورانِ خالص کا تصور ذات اور اس کی شعوری پہنائیوں کے تصور کے ساتھ وابستہ ہے۔

ذات کی یافت سے ہی دورانِ خالص کا ثبوت ملتا ہے۔ ذات کیا ہے؟ اپنی موجودگی کے ایسے احساس کا نام ہے کہ جو یہ کہہ سکے کہ "میں ہوں" موجود ہونے کا احساس اور اظہارِ خودی کا مرتبہ جس ہستی میں جس قدر زیادہ ہوتا ہے وہ پیمانۂ حیات میں اسی قدر بلند ہوتی ہے۔

انسان اگر چہ اظہار خودی کے اعتبار سے پیمانہ حیات پر سب سے اعلیٰ مقام کا حامل ہے تاہم اس کی ہستی یا ذات بھی غیر ذات یعنی ماحول سے مسابقت اور ٹکراؤ سے نشو و نما اور امتیاز پاتی ہے تاہم ہستیٔ حق ایسی خودیٔ مطلق ہے جس کے مقابلے پر کوئی غیر ذات نہیں۔ وہ ایسی آزاد، خود مختار اور بے مثل ذات ہے جس میں دوئی کی بو تک بھی نہیں ہے۔ تاہم غالب کے بقول سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے (۳۰)
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے (۳۱)
سبزہ و گل کہاں سے آتے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے (۳۲)

"Nature is to the Divine self as Character is to the human self."(33)

گویا فطرت کا خدا کی ذات کے ساتھ وہی تعلق ہے جو کردار کا انسان کے ساتھ ہے۔ قرآن اپنے شاندار اسلوب میں مظاہر فطرت کو خدا کی عادتیں کہہ کر پکارتا ہے۔ ہر مظہر ذاتِ الٰہی کی تخلیقی سرگرمی سے ہویدا ہوتا ہے اور ارتقا پاتا ہے، اس لیے اقبال کے نزدیک فطرت کا مطالعہ و مشاہدہ دراصل ذاتِ الٰہی کے رویے اور کردار کا مطالعہ و مشاہدہ ہے۔ گویا ظاہری حقائق کو باطنی حقائق سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ باطنی حقائق اوّل اور ظاہری حقائق آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاہم معنوی اعتبار سے ظاہر و باطن اور اوّل و آخر ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں اور وہ حقیقت، حقیقتِ اولیٰ یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات ہے۔

هو الاوّل والآخِرو الظّاهِرو البَاطِنُ
وَهوَ بِكُلِّ شيءٍ عليم۔(۳۴)

حوالہ جات:

(1) Muhammad Iqbal "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" Sh. Muhammad Ashraf, Lahore: 1962, P28

(۲) اسد اللہ خاں غالب: "دیوانِ غالب" مجلس ترقی ادب، لاہور، ص ۸۶

(3) Muhammad Iqbal "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" P.28.29

(4) As Above, P29

(5) As Above,

(6) As Above, P30

(7) As Above

(۸)اسد اللہ خان غالب، "دیوانِ غالب"، ص ۱۹۴

(9) Muhammad Iqbal "The Reconstruction of Religious Thought in Islam". P31

(۱۰)القرآن، سورۃ الحدید، آیت نمبر ۳

(۱۱)محمد اقبال، "بانگِ درا" شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۷، ص ۱۹۰

(12) Muhammad Iqbal "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" P37

(13) Joad, C.E.M., "A Guide To Philosophy" Victor Gollancz LTD, London 1983, P26

(14) Muhammad Iqbal "The Reconstruction of Religious Thought in Islam", P38

(۱۵)محمد اقبال، "ضربِ کلیم"، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۷۳ء، ص ۱۵

(16) Muhammad Iqbal "The Reconstruction of Religious Thought in Islam", P38

(17) As Above, P40

(18) As Above, P44

(۱۹)القرآن، سورۃ یونس، آیت نمبر ۶

(۲۰)القرآن، سورۃ لقمان، آیت نمبر ۲۹

(۲۱)محمد اقبال، "بالِ جبریل" شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۷۳، ص ۱۲۶

(25) Muhammad Iqbal "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" P50

(26) Muhammad Iqbal "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" P49

(27) As Above

(۲۸)القرآن، سورۃ الفرقان، آیت نمبر ۲

(۲۹)محمد اقبال، "ضربِ کلیم"، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۷۳ء، ص ۷۲

(۳۰)اسد اللہ خاں غالب، "دیوانِ غالب"، ص ۳۰۰

(۳۱) ایضاً

(۳۲) ایضاً

(33) Muhammad Iqbal "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" P56

(۳۴)القرآن، سورۃ الحدید، آیت نمبر ۳

فکر اقبال کے ارتقا کے روشن زاویے

ڈاکٹر صابر حسین جلیسری

گلشنِ دہر میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو کلی نہ ہو سبزہ نہ ہو چمن نہ ہو

بڑا شاعر اپنے عہد کا ترجمان ہی نہیں نباض اور حکیم بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ دقت نظر کے ساتھ لیتا اور فکر عمیق کے ساتھ حالات کا تجزیہ کرتا ہے۔ وہ اپنے حکیمانہ نکات ان لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے جنھیں ان کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ ان کی توجہ ان حقائق کی جانب مبذول کراتا ہے جن کا وہ ادراک نہیں رکھتے۔ وہ انھیں زندگی کا احساس دلاتا اور حقائق زندگی کا شعور پیدا کرتا ہے۔ ان کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرتا اور گرمی گفتار سے ان میں قوتِ عمل پیدا کرتا ہے۔ انھیں اپنی حالت بدلنے پر اُکساتا ہے اور ان میں مدافعانہ قوتوں کو ابھارتا ہے اور اپنی فکر سے ان میں سوچ کے دیے روشن کرتا ہے۔ ایک شاعر کے لیے یہ عمل اس وقت ممکن ہوتا ہے جب وہ خود زندگی کی اعلیٰ اقدار اور ان کی عظمتوں سے کماحقہ آگاہ ہو۔ دقیق فکر و نظر اور غیر معمولی اہمیت رکھتا ہو۔ اسے دینی غیرت اور قومی حمیت کا پاس ہو۔ اس کی ذات دردمندی، خداترسی اور فہم و فراست سے متصف ہو۔ وہ شاعرانہ کمالات کو محض فن برائے فن گردانتا ہو بلکہ اسے عطیۂ خداوندی سمجھ کر خدمت خلق اور اصلاح قوم کا فریضہ انجام دینے کا جواز رکھتا ہو۔ غرض یہ کہ وہ اپنے نظریات کا ابلاغ موثر طور پر کر سکتا ہو۔ حال کے ساتھ ماضی پر بھی اس کی گہری نظر ہو اور وہ مستقبل کا بھی ادراک رکھتا ہو۔ وہ ماضی کے حسن و قبح کو پیش نظر رکھ کر حال کے حقائق کو سمجھ سکتا ہو اور اپنے معاشرے کے افراد کو سمجھا سکتا ہو۔ اس کا کلام ماضی و حال کے درمیان مضبوط اور معتبر رابطہ ہو۔ وہ جو بات کہے ماضی کے حوالے سے جو نصیحت کرے ماضی کے پس منظر میں جو پیغام دے ماضی کی تاریخ کی روشنی میں دے اس کا فکری رشتہ اس کے ماضی سے جتنا قوی اور گہرا ہو گا اس کی بات میں اتنا ہی وزن اس کی نصیحت میں اتنا ہی اثر اور اس کے پیغام میں اتنا ہی جوش اور ولولہ ہو گا۔ ماضی کے حوالے شاعر کی بات میں وزن اور کلام میں تاثیر پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ ماضی کے حوالے سے جو بات کہتا ہے معتبر سمجھی جاتی ہے اور دلوں کو چھونے لگتی ہے۔ ماضی اور حال کے تجزیہ میں مستقبل کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ وہ جب ماضی پر متاسف ہوتا اور حال کی اصلاح پر زور دیتا ہے۔ اس کی نظر روشن مستقبل ہی کو دیکھتی

ہے اور اس کے حکیمانہ اور فکری نکات کا ماحصل مستقبل ہی ہوتا ہے۔

سامنے رکھتا ہوں اس دور نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

اقبال ایسے ہی بڑے شعرا میں سے ہیں جنھوں نے اپنی فکر سے شعور و آگہی کے چراغ روشن کیے اور حکمت و دانائی سے ولولہ تازہ دیا اور زندگی کی اقدار کی حفاظت کی مگر ان کی شاعری کے کئی نمایاں پہلو ہیں۔ لیکن ان کی شاعری کا جو پہلو قطعی واضح اور پر تاثیر ہے۔ وہ ان کی فکر عمیق ہے جو ان کے کلام میں ماضی، حال اور مستقبل کے رشتوں کو استوار کرتی ہے۔

اقبال نے جس دور میں شاعری کا آغاز کیا اس دور کی اپنی خصوصیات ہیں۔ مولانا آزاد، شبلی، حالی اور ان کے رفقا اردو شاعری میں جدت طرازی کا ڈول ڈال چکے تھے۔ غزل کی قدیم روایات دم توڑتی جا رہی تھیں اور سب سے اہم تبدیلی جو اس دور میں نمایاں ہوئی یہ تھی کہ نظیر اکبر آبادی کی روایت شکن روایات کا احیا کیا جا رہا تھا۔ حالی نے "مدوجزر اسلام" لکھ کر شعور و آگہی کی ایک نئی شمع روشن کر دی تھی جس نے ماضی کے دھندلکوں کو چھانٹ کر مستقبل کی راہ سجھائی۔ ان اکابرین سخن نے اردو شاعری کو جو نیا شعور بخشا اس نے وارداتِ قلبی اور رنگین بیانی کی جگہ جدت طرازی اور حقیقت بیانی کی بنا ڈالی۔ اس اسلوب نے شعرا کو نیا شعور اور نیا ادراک عطا کیا اور ان میں زندگی کی قدروں کا احساس پیدا کیا۔ اس سے ان میں خود آگہی اور ژرف بینی کا شعور پیدا ہوا۔ اس میں وطن پرستی کے جذبات ابھرے، متاع عزیز کے لٹ جانے کا احساس ہوا۔ ان میں وطن پرستی کا شعور جاگا، زندگی کی حقیقتیں آشکارا ہوئیں اور ان کے خیال کی وسعتیں ستاروں پر کمند ڈالنے لگیں۔ غم جاناں کی جگہ غم دوراں نے لے لی، فراق ہجر میں تڑپنے والے وطن کی محبت کے گیت گانے لگے اور عناصر فطرت پر چھا گئے۔

اقبال کی فکری نشو و نما اسی ماحول میں ہوئی اور اس سے انھوں نے اکتساب فیض کیا مگر حقیقی فیض انھیں مبدءِ فیاض سے پہنچا۔ جس نے ان کی شاعرانہ صلاحیت کو اوجِ ثریا تک پہنچایا۔ اقبال نے اپنی شاعری کی ابتدا بڑے شاعرانہ انداز سے کی تھی لیکن میدان سخن میں قدم رکھتے ہی ان کے رہوار فکر نے نشانِ منزل تک رسائی حاصل کر لی۔ انھوں نے زبان کی لطافتوں اور شاعرانہ نزاکتوں سے قطع نظر کر کے حصول مقصد کو اپنا مطمحِ نظر بنایا اور ایک ایسا اسلوب اپنایا جو ان سے شروع ہو کر انھیں پر ختم ہو گیا۔ اقبال کا تخیل فطری اور اس کا ابلاغ ابدی صداقتوں کا آئینہ ہے۔ ان کے کلام میں احساس کی قوت اور تاثیر اتنی شدید ہے کہ ان کا ہر قول ایک انمٹ نقش بن کے دل پر ثبت ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اس میں ان کی پکار صاف سنائی دینے لگتی ہے:

دل نہیں شاعر کا، ہے کیفیتوں کی رستخیز
کیا خبر تجھ کو درونِ سینہ کیا رکھتا ہوں میں

اقبال کی حکیمانہ فکر کے کئی اہم زاویے ہیں جو ان کی شاعری کا اہم موضوع ہیں۔ ان نکات سے ان کی فکر و نظر کے جو زاویے ابھرتے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ مسلمانانِ ہند کی اصلاح

۲۔ مغربی تعلیم و تہذیب کی سحر کاری کا بطلان

۳۔ مواخات و امتِ واحدہ کا تصور

۴۔ جاہ پرست علما و صوفیا کی مخالفت

اقبال کے ابتدائی کلام کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی شاعری محض سخن طرازی کے لیے نہ تھی بلکہ اس کے پس منظر میں ایک واضح مقصد کار فرما تھا وہ اس مقصد کے حصول کے لیے قدم بہ قدم فکری راہوں پر گامزن رہے ان کے ابتدائی کلام میں حب الوطنی کے جذبات اس قوم، معاشرے اور افراد کی محبت کے آئینہ دار ہیں جو ان کی اپنی قوم ہے ان کا اپنا معاشرہ ہے ان کے اپنے افراد ہیں۔ اس قوم کی زبوں حالی پر ان کا اپنا دل شدتِ غم سے لبریز نظر آتا ہے۔ اس معاشرے کی نیتی ان کی اپنی خجالت کا سبب بنتی ہے اور ان افراد کی ذلت انھیں اپنی توقیر گراتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ اس حالت کو بدلنے پر قادر تو نہیں ہیں لیکن اس حالت کو بدلنے کا شدید احساس رکھتے ہیں یہی احساس ان کے دل میں وطن کی محبت کے نغمے جگاتا ہے۔ وہ بڑے دلگداز انداز اور پُر تاثیر انداز میں اہل وطن کو باور کراتے ہیں کہ ہمارا وطن، ہمارا معاشرہ اور ہم سب اللہ کی عظیم ترین تخلیق کا ایک حصہ اور خالق کائنات کے وجود کی روشن دلیل ہیں ہمیں اس کی زمین پر عظمت ربانی کا وارث اور اس کی جباری و قہاری اور قدوسی کا پرتو ہونا چاہیے اور اس کا پرتو ہمارے ماحول معاشرے اور ہماری روزمرہ زندگی میں واضح طور پر نظر آنا چاہیے ان کی فکر کا یہی زاویہ ان کی شاعری کی اساس ہے۔

اقبال کی فکر اولیں ان عیوب و نقائص کا احاطہ کرتی ہے جو جسد قومی کا جزو بن گئے تھے۔ اور قوم میں اتنی گہری جڑ پکڑ گئے تھے کہ قومی مزاج بن گئے تھے اور ان کے مضر اثرات کا کسی کو احساس تک نہ تھا ان میں نہ دولت تھی نہ دولتِ احساس، نہ عزت، نہ وقار، نہ جوش ولولہ نہ ذوقِ عمل، فہم و فراست کو پس پشت ڈال کر انتشار اور اخلاقی پستی میں مگن۔ علما فرقہ بندی اور مذہبی تعصب میں مبتلا سائنس اور جدید علوم سے بے بہرہ خیالی فلسفہ اور ضعیف الاعتقادی میں گرفتار حقیقت سے فرار حاصل کیے ہوئے تھے۔ نہ ان میں سرفروشی تھی نہ جذبہ جہاد، فکر معاش نے ان کی روح کو مردہ کر دیا تھا۔ مفلسی نے انھیں بے حس بنا دیا تھا وہ تلاش حق سے بیگانہ تحقیق و اجتہاد سے بے نیاز اور روایت کے پھندوں میں گرفتار منتظر فردا تھے اقبال کی ژرف نگاہی نے ان عیوب و نقائص کا مشاہدہ کیا اور ان کی حاملِ فطرت نے انھیں اکسایا کہ وہ ان کے تدارک کی تدبیر کریں مگر اس وقت ان کے پاس ان خرابیوں کے علاج کا کوئی موثر نسخہ نہ تھا تاہم ان کے خلاف جو درد وہ اپنے دل میں رکھتے تھے اس کا اظہار وہ اپنی شاعری میں کرتے رہے اور اس قومی بگاڑ کی جانب قوم کی توجہ مبذول کراتے رہے ان کی ابتدائی دور کی نظمیں تصویر درد صدائے درد دل، شمع اور انسان، بزم قدرت، آفتاب صبح اور گل پژمردہ ان کے انھیں جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آب گنگا تو مجھے

سرزمین اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق انگیز ہے
بدلے یک رنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
بزم جہاں میں میں بھی ہوں اے شمع درد مند
فریاد در گرہ صفتِ دانۂ سپند
ہمچو نے از نیستانِ خود حکایت می کنم
بشنو اے گل از جدائی ہا شکایت می کنم
نور سے دور ہوں ظلمت میں گرفتار ہوں میں
کیوں سیہ روز سیہ بخت سیہ کار ہوں میں

ان اشعار میں دردمندی کے وہ جذبات مکمل طور سے عیاں ہیں جو قوم سے ان کی جذباتی وابستگی کا مظہر ہیں ان کی نظموں کے مطالعہ سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کے دل میں قوم کی اخلاقی روحانی اور معاشرتی پستی کا احساس کتنا گہرا اور ان کے تدارک کی خواہش کتنی شدید تھی۔ وہ اپنی قوم کے افراد کو ان نقائص سے آگاہ ہی کرنا نہیں بلکہ ان سے انھیں نجات بھی دلانا چاہتے تھے اور اس کے لیے وہ سرمایۂ فکر بہم پہنچا رہے تھے۔ ایک ایسا فکری سرمایہ جو ملت بیمار کے دکھوں کا مداوا کرنے والا تھا اس سے قوم کی نجات کا حل تلاش کرنا مقصود تھا، تاہم وہ قوم کی اصلاح کی طرف بھی مائل تھے۔

ہر درد مند دل کو رونا مرا رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تیری تقریر سے

تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے پھر نہ سیہ کار رہے

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

یہی آئین فطرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے
مجھے راز دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

اقبال کے اشعار کا ایک ایک مصرعہ ان کی فکر کا پرتوان کے مشاہدے کی قدرت کا شاہکار ہے۔ان نظموں میں اقبال اپنے حال کا مکمل ادراک کرتے نظر آتے ہیں ان کا دل تڑپتا ہے مگر ان کی مجبوری یہ ہے کہ ان کی قوم کو اس تڑپ کا احساس نہیں ہے کیوں کہ وہ ناگفتہ بہ حالات سے اس درجے مانوس ہو چکی ہے کہ اس کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا ہے صرف شاعر کی ذات ہے جس کے قلب تپاں نے اس پستی اور ذلت کو محسوس کیا ہے اور اب وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح اپنی مردہ قوم کے قلب خوابیدہ میں گرمیٔ احساس پیدا کردے۔اسے نالہ درد سے تڑپا دے اور اپنی فغانِ نیم شبی سے اس کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دے۔اقبال کے جذبات کی کیفیت اس شعر میں ملاحظہ فرمایئے۔

صفحۂ ایام سے داغ مرادِ شب مٹا
آسماں سے نقش باطل کی طرح کوکب مٹا

اس شعر میں ایک طرف تو آفتاب صبح سے خطاب ہے اور دوسری طرف درد کی اس کسک کا اظہار ہے جو آفتاب صبح کی قدرت کو دیکھ کر شاعر کے دل میں اپنی بے مائیگی کے احساس سے پیدا ہوئی ہے۔شاعر جانتا ہے کہ آفتاب صبح کے طلوع ہوتے ہی کوکب مٹ جائیں گے لیکن پھر بھی شدید تمنا کے اظہار میں کہتا ہوں،"نقش باطل کی طرح کوکب مٹا" یہ شدید رد عمل ہے اس جذبہ کا جو شاعر کے دل میں پنہاں ہے کہ کس طرح وہ کرۂ ارض سے نقش باطل مٹا دے مگر اس پر وہ قدرت نہیں رکھتا چناں چہ رد عمل کے طور پر آفتابِ صبح سے کہتا ہے کہ نقش باطل کی طرح آسمان سے کوکب مٹا دے کیوں کہ وہ اس کی قدرت رکھتا ہے۔اس طرح وہ ایک روشن صبح کے منتظر ہیں جو ان کی قوم کی منزل کی راہ کو جگمگا دے۔اس نوع کے اشعار سے مترشح ہوتا ہے کہ اقبال کی نوحہ خوانی ایک بلند و اعلیٰ مقصد کو متعارف کرانے اور اس کے حصول کی راہیں متعین کرنے کے لیے تھی۔ان کے کلام میں یاس و کرب کی کیفیت بعض وقت رومانوی عنصر کے روپ میں ان کے مقصد پر محیط نظر آتی ہے۔تاہم حصول مقصد کے لیے جو راہ وہ متعین کرتے ہیں وہ ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی ہے۔انھوں نے آہوں کے آہنگ میں جادہ منزل کی راہ سجھائی ہے۔

اقبال کی شاعری کے دوراول کی تخلیقی کاوشوں کا حاصل یہ نکات ہیں، حب الوطنی، اتحاد، اخوت، حقیقت پسندی، غم ہستی، غم

روزگار اور ماضی کی عظمتوں کا ادراک۔ ابتدائی دور میں یہ نکات محض شاعرانہ اصطلاحات کا درجہ رکھتے ہیں یعنی انھوں نے عام شاعرانہ انداز میں ان کی افادیت کا احساس بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان کی شاعری کا دورِ ثانی اس احساس کی آنچ کو اور تیز کرتا ہے۔ ان کی فکر میں گہرائی اور دقتِ نظر پیدا ہوتی ہے ان کا سوزِ دروں کچھ اور بھڑکتا ہے۔ انسانی عظمت کا احساس اجاگر ہوتا ہے اور ان کی فکر آفاقی وسعتوں کو چھو سکتی ہے۔ لندن میں اقبال کا قیام ان کی حکمت عملی کے باب میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں انھیں مغربی علوم کے براہِ راست مطالعے کا موقع ملا انھوں نے مغربی دنیا کے جدید سائنس اور فلسفیانہ علوم تک براہِ راست رسائی حاصل کی مغربی تہذیب اور معاشرے کا بنظرِ غائر مشاہدہ کیا اس سے ان کے اندر وسعتِ نظر پیدا ہوئی اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مغربی فلسفہ کو پرکھا۔ اسلامی تعلیمات سے مغربی تعلیمات کا موازنہ کیا اور اصولوں سے اصولوں کا ملا کر دیکھا اور دونوں کے مابین جو نمایاں فرق واضح ہوا اسے نہایت پرخلوص جذبے کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ اس مطالعے کی روشنی میں وہ غیر اسلامی افعال و افکار کی تکذیب کرتے ہیں اسلامی تعلیمات اور اسلامی روایات کی روشنی میں جب وہ مغربی علوم کے اثرات اور مغربی تہذیب کی سحر کاری پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ دونوں پہلو انھیں مسلم قوم کے حق میں مضر رساں اور غیر مفید نظر آتے ہیں۔ اقبال نے قرآن اور سنت سے اکتسابِ علم کیا ہے ان کا فکری سرمایہ بھی قرآن و سنت ہی سے ماخوذ ہے۔ قرآن و سنت کے دقیق مطالعے اور حکیمانہ فکر کی خصوصیات نے مغربی تہذیب اور افکار کو ان کی نظر میں گرا دیا ہے۔

اقبال جانتے تھے کہ دنیا کی دیگر قومیں اپنی ذہنی صلاحیتوں اور تخلیقی قوتوں کے سبب ارفع و اعلیٰ مقام حاصل کر رہی تھیں اور امت مسلمہ اور خاص طور سے مسلمانانِ ہند اس مقام سے محروم تھے۔ ان کی نظر میں مسلمانوں کی پستی اور بے عملی کا سبب یہ تھا کہ وہ علم سے محروم تھے وہ علم جو مسلمانوں کی میراث ہے انھیں حاصل نہ تھا انھوں نے دین مبین اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے منہ موڑ لیا تھا لہٰذا وہ اعلیٰ صفات جو بحیثیت مسلمان ان کی ذات میں ہونی چاہیے تھیں وہ ان سے محروم تھے۔ اقبال جانتے تھے کہ جب تک مسلمان اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اسلامی تعلیمات اور قرآنی کلیات پر عمل پیرا نہ ہوں گے اپنا کھویا ہوا وقار اور اصل منصب حاصل نہیں کر سکتے چناں چہ وہ حصولِ علم کی طرف قوم کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ اور بالخصوص قوم کے نوجوان طبقے پر توجہ دیتے ہیں اور ان میں قوتِ عمل پیدا کرنے اور خود آگہی کا احساس پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ نوجوانوں کی توجہ ایک روحانی جذبے کی طرف مبذول کراتے ہیں جو اسلامی تعلیمات کی اساس ہے یہ جذبہ عملِ صالح پر اکساتا ہے۔ عملِ صالح سے روح کی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ روح کی پاکیزگی سے عزتِ نفس کا جذبہ قوی ہوتا ہے۔ عزتِ نفس سے اپنی ذات تک رسائی حاصل ہوتی ہے اور انسان اپنی حقیقت کو پہچان لیتا ہے اور اسے وہ ذات ہر شے پر محیط نظر آتی ہے جو اس کی اور کل کائنات کی خالق ہے یہ خود آگہی کا جذبہ اسے غیر اللہ کے سامنے جھکنے یا خوف سے روکتا ہے اور صرف اللہ کو قادرِ مطلق مانتے ہوئے اسی سے خیر و شر کی توقع رکھنا سکھاتا ہے۔ اس احساس اور جذبے کو اقبال نے متعدد مقام پر خودی کے نام سے تعبیر کیا ہے اور یہی جذبہ وہ اپنی قوم کے نوجوانوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک طبقہ وہ تھا جو

انگریزی تعلیم کے زیرِ اثر مغربی تہذیب کا دلدادہ تھا اور مذہب کو ایک فرسودہ اور غیر مفید عمل سمجھتا تھا اور دوسرا طبقہ ان صاحب بصیرت افراد پر مشتمل تھا وہ مغربی علوم کی افادیت تک تو اس کے موافق تھے مگر اسے فکر و عمل کا جزو بنانے کے خلاف تھے۔ اقبال طبقہ ثانی کے سرخیل تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مغربی تہذیب مسلمان نوجوانوں کو سعی و عمل کی بجائے عیش کوشی اور ذہنی آسودگی کی طرف مائل کرتی ہے۔ مغربی افکار ان کی روحانی قوتوں کو جو اسلامی رشتے سے انھیں ودیعت ہوئی تھیں سلب کرتے ہیں اور ان کی تاریخ سے ان کے ذہنی رشتوں کو منقطع کرتے ہیں اس لیے وہ چاہتے تھے کہ نوجوان جدید زیور تعلیم سے آراستہ ہوں مگر کور بینی اختیار نہ کریں بلکہ صاحب نظر اور روشن ضمیر بنیں۔ کائنات پر غلبہ حاصل کریں۔ اور عناصر فطرت پر چھا جائیں اسلامی تہذیب پر عمل پیرا ہوں اور ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مشعل راہ بنائیں۔ وہ انھیں فرنگی سحر سے نکال کر راہ حجاز دکھاتے ہیں اور باور کراتے ہیں کہ ان کی ذات خاک حرم ہی سے پیوند ہے اور وہ اپنی اصل میں مصطفوی ہیں لہٰذا نظام مصطفیٰ ہی انھیں بامِ عروج و دوام بخش سکتا ہے وہ اس نکتے کو فیضی کی زبان میں یوں سمجھاتے ہیں۔

تو اے پروانہ ایں گرمی ز شمع محفلے داری
چو من در آتش خود سوز گر سوزنے داری

اقبال جب حصول علم کی گفتگو کرتے ہیں تو ان کی مراد اس علم سے ہوتی ہے جو نوجوانوں میں خودی کو بیدار کرتا اور انھیں تخلیقی مقاصد کا شعور بخشتا ہے۔ اس شعور کے تحت انسان مومن کی شان جیتا اور مومن کی شان مرتا ہے۔ جذبہ جہاد خواہ فروغ دین کے لیے ہو، حصول علم کے لیے ہو، تربیت اولاد کے لیے ہو یا ضروریات حیات کے لیے اس کا مقصد مطلوب ہوتا ہے۔ وہ اس علم کے مخالف ہیں جو ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے ایسا علم عزت نفس کو کچلتا اور عملی زندگی سے متنفر کرتا ہے۔ اس پہلو کو سامنے رکھ کر انھوں نے صوفیا کی مخالفت کی اور جاہ پرست علما سے بیزار رہے۔ اس دور میں علما مختلف دینی مکاتبِ فکر سے وابستہ تھے۔ وہ اپنے اپنے نکتہ نظر کی تبلیغ میں سرگرم عمل تھے۔ ان کے عمل سے اقبال نے اس دور میں جو نتائج اخذ کیے اس کے مطابق اس دور کے اکثر علما ٹھوس علم، شوق تحقیق اور اخلاقی جرأت اور اعلائے کلمتہ الحق سے محروم تھے۔ صاحبانِ اقتدار کی تعریف و توصیف میں ایک دوسرے سے آگے اور سطحی مسائل پر مناظروں اور مناقشوں میں وقت ضائع کر رہے تھے اور افتراق و نفاق کو ہوا دے رہے تھے اور دینی تعلیم کے پردے میں ترکِ دنیا سکھا رہے تھے۔ اقبال کہتے ہیں کہ علما نائب رسول ہیں نیابتِ رسول ﷺ کا تقاضا ہے کہ وہ امت کو ایک مرکز پر متحد کر کے اپنے فکر و عمل سے ان میں جذبہ جہاد اور دینی تڑپ پیدا کر دیں۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ علما کی حالت یہ ہے کہ جاہ پرستی نے انھیں قرآن کی روحانی قوت سے نابلد کر دیا ہے اور اس سے وہ اکتساب علم کی بجائے غیر مسلموں کی غلامی کی دلیلیں پیش کرنے لگے ہیں۔ کلمتہ الحق بلند کرنے اور دشمنان اسلام کے خلاف صف آرا ہونے کی بجائے باہم دست و گریباں ہو رہے ہیں۔ فروعی اختلافات کو ابھار رہے ہیں اور اپنی توانائی غیر مفید مباحث میں صرف کر رہے ہیں۔ ان کی تقاریر میں اتنا اثر ہے کہ نئی نسل کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں نہ ہی ان کی تحریر سے کوئی تحقیقی نکتہ سامنے آتا ہے جو فرنگی تعلیمات کا بطلان کرتا ہو۔ موجودہ دور اسلام اور مسلمان دونوں کے لیے ابتلا کا دور

ہے اس دور میں جہاد کا نعرہ بلند ہونا چاہیے۔ اسلام دشمن قوتوں کو للکارنا چاہیے مگر علما کی صفوں سے نہ کوئی نعرۂ حق بلند ہوتا ہے نہ کسی للکار کی آواز آتی ہے۔ یہ میدانِ عمل میں آنے کی بجائے مراقبے میں چلے گئے۔ اقبال ان کی اس بے عملی کی کیفیت اور خوابیدہ نفسی کو رہبانیت کے متبادل گردانتے ہیں۔ حدیث ہے "اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں" برخلاف اس کے امت مسلمہ کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے یعنی اس امت کے لیے روحانی ترقی کا راستہ ترک کر دینا نہیں بلکہ اس کی راہ میں جہاد ہے۔ اقبال چاہتے ہیں کہ علما یہ سبق قوم کے نوجوانوں کے دلوں میں اتار دیں۔

جہاد کے علاوہ اقبال جس نکتہ پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں وہ ہے اتحاد ملت۔ وہ ملتِ اسلامیہ کو جسد واحد تصور کرتے ہیں ان کی دینی حمیت یہ گوارہ نہیں کرتی کہ ملتِ اسلامیہ کے جسد واحد میں کہیں شگاف پڑ جائے وہ مفکر اسلام اور حکیم الامت کی حیثیت سے جب مسلمانوں کی اجتماعی حالت پر غور کرتے ہیں تو انھیں ان کے باطن میں وہ نقائص نظر آتے ہیں عالم شعور جن کا ادراک نہیں کر سکتا۔ وہ یہ دیکھ کر مضطرب ہو جاتے ہیں کہ ملت اسلامیہ پارہ پارہ ہو گئی ہے۔ وہ غور کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں یہ افتراق کیوں ہے اور ان کے دینی رشتے میں وہ کشش کیوں نہیں رہی جو انھیں ایک اور صرف ایک بنا دے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مسلمان رنگ و نسل کی بنیاد پر تقسیم ہوئے ہیں۔ تورانی، ایرانی اور افغانوں کا شعور ان کی فکر پر غالب آگیا ہے اور اس شعور نے ان کی روحانی قوتوں کو تقسیم کر دیا ہے وہ آفاق پر چھا جانے کی بجائے اپنی ذات میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان میں اجتماعی مفاد کی فکر کے بجائے انفرادی تشخص ابھر رہا ہے۔ خدا اور رسول ﷺ کی ذات کو مرجع شوق بنانے کی بجائے اپنی تمام قوتیں زمین کے اس ٹکڑے کے لیے وقف کر دی ہیں جس پر وہ بستے ہیں اور جسے وہ اپنا وطن کہتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے دنیاوی رشتے استوار کر کے دینی رشتے منقطع کر لیے ہیں تنگ نظری اور تعصب کا شکار ہو کر دنیا میں کمزور اور حقیر ہو کر رہ گئے ہیں۔

اقبال کے خیال میں وطن ایک مخصوص طرز معاشرت کی شناخت کی علامت اور اجتماعی زندگی میں مسرتوں کے حصول کا ذریعہ ہے انفرادی زندگی میں اس کی اہمیت ہے۔ مگر انفرادی تصور جب اجتماعی مفاد پر غالب آجائے اور معاشرے کی محبت دینی رشتوں کو کمزور کر دے تو یہ رجحان مواخات و دینی اتحاد کی نفی کا سبب بن جاتا ہے۔ بعد میں وہ وجود وطن کے تصور اور وطنیت کے جذبے کی مذمت کرتے ہیں۔ اور اسے اسلامی اخوت کے تصور کے لیے غیر مفید گردانتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "وطنیت" ان کے افکار کی آئینہ دار جس میں وہ کہتے ہیں:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ ترا شیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

یہ اشعار محتاج تشریح نہیں ہیں نہایت واضح وغیر مبہم اور بلیغ انداز میں بتایا گیا ہے کہ وطنیت کے جذبے نے دینی روح کو مجروح کیا ہے۔ مسلمانوں کی اصل قوت جس نے انھیں دنیا میں سربلند کیا تھا ان کا ملی اتحاد تھا اب بھی اگر مسلمانوں میں یہ اتحاد قائم ہو جائے تو وہ اقوام عالم میں اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ اقبال کی فکر کا حکیمانہ نکتہ ہے اور اس سے یہ پہلو کہیں بھی اجاگر نہیں ہوتا کہ وہ جذبہ حب الوطنی کے خلاف تھے۔ البتہ وہ اس ذہنیت کے خلاف تھے جو اسلامی اخوت کی نفی کرتی ہو۔ اور اس کے مقابلے میں وطن پرستی کے جذبات ابھارتی ہے۔ اس دور میں وطن پرستی کے جذبات نے ہی امت مسلمہ کے درمیان نفاق کا بیج بویا تھا۔ ترک اور عربوں کے اختلافات، افریقی مسلمانوں کی جدوجہد آزادی سے دیگر خطوں کے مسلمانوں کی عدم دلچسپی ایسے رجحانات تھے جنھوں نے مسلمانوں کی فکری اور عملی قوتوں کو مفلوج کر دیا تھا وہ ایک دوسرے سے بے بہرہ اور لاتعلق ہو گئے تھے اور ان میں بعد مکانی اور جغرافیائی حدود وقیود کا احساس اس قدر راسخ ہو گیا تھا کہ وہ مواخات کی روح کو قطعی فراموش کر بیٹھے تھے اور انھوں نے اسلامی برادری کے آفاقی تصور کو جس نے انھیں مشرق سے مغرب تک ایک مضبوط رشتے سے منسلک کر دیا تھا فراموش کر دیا۔ مسلمانوں کا ہر طرز فکر اقبال کے نزدیک دین مبین کی اساس پر ضرب کاری لگانے کے مترادف تھا لہٰذا انھوں نے جذبہ وطنیت کی بھرپور مذمت کی اور قوم کو بتایا کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے عروج وعظمت کا سبب ان کی جغرافیائی یا نسلی برتری نہ تھی بلکہ ان کا اتحاد اور جذبہ اخوت تھا تقریباً بارہ سو سال قبل یوسف بن تاشفین افریقہ کے سیاہ فام قبائلی سرداروں کی جمعیت کے ساتھ اسپین کے عرب حکمرانوں کی اعانت کے لیے اس لیے نکلا تھا کہ وہ اس کے دینی بھائی تھے۔ وہاں عیسائی قوم کے ہاتھوں عربوں پر نہیں اسلامی اقتدار اور اسلامی حرمت پر ضرب لگ رہی تھی اور وہاں عربوں کے پندار اسلام کی عظمت مجروح ہو رہی تھی لہٰذا اس کے جذبہ اخوت اور اسلامی حمیت کے سبب کم از کم اس دور کے اسپین میں اسلامی حکومت کا وقار مجروح ہونے سے بچ گیا۔ اقبال چاہتے ہیں کہ ویسا ہی جذبہ اخوت ان کے دور کے مسلمانوں میں بھی بیدار ہو جائے تاکہ مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لیں اور اسلام کی عزت ایک بار پھر بحال ہو جائے۔ حکیم الامت علامہ اقبال کے افکار وحکیمانہ خطاب کی روشنی میں گر آج ہم اپنے حال کا جائزہ لیں اور غور کریں کہ اس رجل عظیم اور مرد قلندر کے افکار سے ہم نے کتنا فیض پایا تو ہمیں سوائے خجالت کے اور ندامت کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اقبال اور نطشے

ثناء الرحمان

ہر بڑا مفکر، مدبر، شاعر، ادیب اپنے پیش رووں اور ہم عصروں سے کسی نہ کسی لحاظ سے ضرور متاثر ہوا کرتا ہے۔ اس معاملے میں وہ مذہب و ملت، رنگ و نسل ملکی و غیر ملکی کی کوئی قید روا نہیں رکھتا۔ پروفیسر آل احمد سرور حسرت موہانی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

ایک بڑا مفکر اور شاعر درد اور شوق کی دنیا کے سب ناموروں کا عقیدت مند ہوتا ہے کیوں کہ دھوپ ہر آنگن میں چمکتی ہے۔ کسی مقام کی پابند نہیں ہوتی۔ (۱)

نبی اکرمؐ نے بھی فرمایا ہے کہ:

حکمت مومن کی گم شدہ میراث ہے یہ جہاں سے ملے اسے لے لینا چاہیے۔

اسی طرح ہر بڑے مفکر و مدبر کی طرح اقبالؒ نے بھی مشرق و مغرب کی بے شمار علمی اور ادبی شخصیات سے کسبِ فیض کیا ہے اور اپنے کلام میں ان کی ہیئت اور فکر کا مختلف پیرایوں میں اظہار کیا ہے۔ انھوں نے حافظ، سعدی، رومی، جامی، نظیری، عرفی، طالب، بیدل اور غالب سے بھی استفادہ کیا ہے اور گوئٹے، نطشے، برگساں، شوپن ہار، کانٹ، ہیگل سے بھی۔ اقبال نے ان شعرا اور مفکرین کا تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا ہے اور ان کے صرف انہی نظریات و افکار کو قبول کیا ہے جو اسلام اور انسانیت کی بنیادوں کو استوار کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہر دور میں معاشرہ خیر و شر کا آمیزہ ہوتا ہے۔ معاشرے کی مذہبی، اخلاقی، سماجی اور تہذیبی اقدار کتنی ہی پست کیوں نہ ہوں، ان کے اندر افراد کا ایک ایسا گروہ ضرور ہوتا ہے جو خود بھی اعلیٰ اقدار کا مالک ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی انسانیت کے حقیقی روپ میں جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہے۔ ہر عہد میں گویا مثالی انسان کی تلاش یا اس کی بازیافت مفکرین اور دانشور طبقے کا خواب رہا ہے۔ مختلف مفکرین نے ایسی شخصیت کو مختلف ناموں سے پکارا ہے افلاطون ایسی مثالی شخصیت کو "فیلسوف" کہتا ہے۔ ارسطو اسے "مثالی انسان" (Ideal man) کے نام سے پکارتا ہے۔ اروبندو گھوش اس کے لیے "مردِ کامل" کی اصطلاح وضع کرتا ہے (۲) نطشے اسے "فوق البشر" (Super man) اور ایمرسن اسے "انسانِ بالا" (Over man) کا نام دیتا ہے۔ مولانا رومؒ اس کے لیے "انسانِ کامل" جبکہ اقبال

اس کے لیے "مردِ مومن" کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔

اقبال کے بعض ناقدین کا خیال ہے کہ اقبال نے "مردِ مومن" کا تصور نطشے کے "فوق البشر" سے لیا ہے مثلاً پروفیسر جی این لیوس کا خیال ہے کہ:

> اقبال کے تمام فلسفے کی اساس نطشے کے فلسفے پر ہے اور اُس کا مردِ مومن نطشے کے فوق البشر سے ماخوذ ہے۔(۳)

جب کہ کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ اقبال کے "مردِ مومن" نطشے کے فوق البشر اور رومیؒ کے مردِ کامل کا حسین امتزاج ہے۔

اردو کے نامور نقاد پروفیسر آل احمد سرور کا کہنا ہے کہ:

> اقبال نے اپنا فلسفہ زندگی نطشے سے اخذ کیا ہے وہ مردِ منتظر کے قائل ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ نطشے کا "فوق البشر" اقبال کے ہاں آکر "خیر البشر ہو گیا ہے۔(۴)

اسی ضمن میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی رائے ہے کہ:

اقبال کے اندر رومی بھی ہے اور نطشے بھی، کانٹ بھی اور برگساں بھی، کارل مارکس بھی اور لینن بھی اور شاعری کے لحاظ سے بیدل بھی اور غالب بھی۔ لیکن اقبال کے اندر ان سب میں سے کسی کی اپنی حیثیت جوں کی توں قائم نہیں رہی رومی کا انسانِ کامل اور مردِ عارف، نطشے جیسے کافر کے فوق الانسان سے ہم کنار ہو کر اقبالی انسان بن گیا ہے(۵) ذیل میں ہم اقبال اور نطشے کے فلسفے کے مماثل اور مخالف پہلوؤں کا مختصر اُجائزہ لیتے ہیں۔

(۱) اقبال اور نطشے دونوں جذبۂ باطن کو فنِ لطیف کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں مثلاً اقبال کہتے ہیں:

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
جو دل کا نور ہے وہ آنکھوں کا نور نہیں(۶)

اقبال، رومی اور نطشے تینوں کا یہ نظریہ ہے کہ تخلیق کے عمل میں جذبہ حیات اصل جب کہ عقل ثانوی حیثیت رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان تینوں شخصیات نے سقراط اور افلاطون کے عقلیت پر مبنی فلسفے اور تہذیب کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اقبال کے نزدیک دین کا چشمہ بھی جذبہ حیات یا جذبہ عشق ہی سے پھوٹتا ہے نطشے اور اقبال دونوں اس علم کے مخالف ہیں جو جذبات میں گرمی پیدا نہیں کرتا جو جسم کی آرائش تو کرتا ہے روح کی نوک پلک نہیں سنوارتا۔

(۲) نطشے عیسائیت کا شدید مخالف تھا اس نے عیسائیت کو عروج انسانی کا بدترین دشمن قرار دیا ہے اس کے خیال میں عیسائیت نفی حیات کا مذہب ہے اس نے اپنے پیروکاروں میں مریضانہ عاجزی اور بے ثمر رہبانیت پیدا کی ہے۔ اس کے نزدیک یہ زندگی سے گریز کی تعلیم دیتی ہے۔ اقبال بھی رہبانیت اور اس سے مشابہ خانقاہی نظام کی اپنی نظم و نثر میں مختلف جگہوں پر شدید مخالفت کرتا ہے اسی تناظر میں درج ذیل اشعار کا حوالہ قابلِ مطالعہ ہے:

حریف اپنا سمجھ رہے ہیں مجھے خدایانِ خانقاہی
انھیں یہ ڈر ہے کہ میرے نالوں سے شق نہ ہو سنگ آستانہ (۷)

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ دلگیری
ترے دین و ادب سے آرہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری (۸)

اقبال اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ عیسائیت پر جو کاری ضرب نطشے نے لگائی ہے وہ کسی اور نے نہیں لگائی۔ اقبال نے پیامِ مشرق میں نطشے کی تعریف میں ایک نظم لکھی ہے جس میں اسے ایک ایسے دیوانے کی صورت میں پیش کیا ہے جو شیشہ گروں کی کارگاہ میں لٹھ لے کر گھس گیا ہے اور تمام سامانِ فریب کو چکنا چور کر دیا ہے۔

(۳) نطشے جمہوریت کا شدید مخالف تھا اسی طرح اقبال بھی اس کے خلاف کچھ تحفظات رکھتا ہے۔ اقبال کے نزدیک مغرب کا جو جمہوری نظام ہے اس میں انسان کے ایمان اور کردار کی نسبت ووٹوں کی تعداد کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اقبال مغربی سیاستدان اور مفکر اسٹنڈل کے حوالے سے جمہوریت پر کچھ اس طرح تنقید کرتے ہیں کہ:

اس راز کو اس مردِ فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے (۹)

نطشے کے نزدیک جمہوریت اعلیٰ درجے کے آزاد افراد کی سرکوبی کا ایک طریقہ ہے اس کے نزدیک نظام ایسا ہونا چاہیے جو انسان کی صلاحیتوں کو جلا بخشے، انسان کو قول و فعل میں آزادی دے اور تقلید کی روش سے چھٹکارا عطا کرے۔ اقبال تو تقلید کے معاملے میں اس حد تک سخت رویہ رکھتے ہیں کہ وہ تقلید کی روش اختیار کرنے کی بجائے، خودکشی کرنے کو بہتر خیال کرتے ہیں:

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے (۱۰)

(۴) اقبال اور نطشے دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ "خدا کو تلاش کرنے سے پہلے آدمی اپنے آپ کو تلاش کرے" کیوں کہ "خدا ہم در تلاش آدمی ہست۔"

نطشے خدا کے وجود کا منکر تھا۔ اقبال خدا کے وجود کا تو منکر نہیں تھا لیکن جب ہم کلامِ اقبال کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس بات کا پتا چلتا ہے کہ انھوں نے جہاں بھی آدم اور خدا کا موازنہ کیا ہے تو خدا کی خدائی کے ساتھ شکوہ کیا ہے درج ذیل رباعی قابلِ غور ہے:

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے
خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی استغفر اللہ
یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے (۱۱)

یعنی خدا کا اہتمام کون و مکاں بلا شبہ ایک دشوار کام ہے لیکن بندگی کا معاملہ اس سے بھی دشوار ہے جب ہم اقبال اور نطشے کے درمیان اختلافی پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ

❶ نطشے خدا کے وجود کا انکاری ہے وہ لفظ Spirit (نفس) کو اپنے ہاں استعمال نہیں کرتا۔ وہ کسی ادبی و ابدی خیر و شر کے مطلق تفریق و تقسیم کا قائل نہیں۔ وہ پیکار حیات اور ارتقا کا ماننے والا ہے۔ اس کے الفاظ میں "خدا کا انتقال ہو چکا ہے" وہ اس بات کا قائل ہے کہ جب تک انسان کے دل سے خدا کا تصور پورے طور پر ختم نہیں ہو جاتا، وہ اپنی موجودہ غلامانہ حالت سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ اس بات کی دلیل یوں دیتا ہے کہ جب تک انسان دیوی دیوتاؤں اور طلسمات کے قائل تھے سائنس اور حکمت پیدا نہ ہو سکی جونہی یہ تصور مدھم پڑا تو یہ دونوں ترقی کی انتہاؤں کو چھونے لگ گئے جب کہ اقبال کے نزدیک، انسان کے اندر حقیقی انسانیت آتی ہی اس وقت ہے جب وہ خدا کے وجود کا ماننے والا اور اس کے احکامات و فرامین پر عمل پیرا ہو جاتا ہے۔ جب کہ خدا کے وجود کا منکر ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں بتدریج دھنستا چلا جاتا ہے۔

❷ نطشے کے فوق البشر کی بنیاد "مادیت" جب کہ اقبال کے مردِ مومن کی "روحانیت" پر ہے۔

❸ نطشے کے خیال میں کائنات کے جاندار و غیر جاندار اجزا مرنے کے بعد دوبارہ جنم لے لیتے ہیں اور فنا و بقا کا یہ عمل بار بار ہوتا ہے۔ یہ عمل اسلامی تعلیمات کے بالکل الٹ ہے۔ اس ضمن میں اقبال نے نطشے کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ ان پر اختلافات کے باوجود اقبال نے نطشے کے کافی خیالات کا اثر قبول کیا ہے اور اپنے کلام میں متعدد جگہوں پر ان کا اظہار کیا ہے۔

پیامِ مشرق میں اقبال نے نطشے پر ایک نظم لکھی ہے جس کے نیچے اس نے ایک فٹ نوٹ بھی دیا ہے۔

"نطشے نے مسیحی فلسفہ اخلاق پر زبردست حملہ کیا ہے اس کا دماغ اس لیے کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے گو بعض اخلاقی نتائج میں اس کے افکار مذہب اسلام کے بہت قریب ہیں "قلب مومن دماغش کافر است" نبی اکرمؐ نے اس قسم کا حملہ "امیر ابن الصالت" (عرب شاعر) کی نسبت فرمایا تھا اسی بات کا اطلاق نطشے پر بھی ہوتا ہے اقبال کے فلسفے میں اصل چیز دل ہے دماغ نہیں، زیادہ قابل اہمیت چیز عشق ہے عقل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نطشے کے دماغ کے کافر ہونے سے قطعاً نہیں گھبراتا۔

اقبال کے نزدیک نطشے ایک مجذوب تھا جو سیدھے راستے کا متلاشی نہیں تھا لیکن وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ نطشے اپنی عمر کے آخری حصے میں دیوانہ ہو گیا تھا یعنی پہلے اس کا رشتہ خدا سے ٹوٹا تھا پھر اپنے آپ سے بھی ٹوٹ گیا اقبال کے نزدیک وہ اپنے مذہبی تجربات کا درست تجزیہ نہ کر سکا، جذب و عشق کی فراوانی کا نتیجہ دیوانگی کی صورت میں نکلا۔ بدقسمتی سے اسے ایسا کوئی قابل اعتماد روحانی رہنما بھی نہ مل سکا جو اسے سیدھے راستے کی طرف رہنمائی فراہم کرتا ۔ اقبال کا ایک شعر ہے کہ جو نطشے کے متعلق

اقبال کے خیالات کی خوب عکاسی کرتا ہے:

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے (۱۲)

اس شعر پر اقبال نے ایک نوٹ لکھا ہے کہ:

وہ جرمن کا مشہور مجذوب فلسفی نیٹشا جو اپنی وارداتِ قلبی کا صحیح اندازہ نہ کر سکا اور اس لیے اس کے فلسفیانہ افکار نے اسے غلط رستہ پر ڈال دیا۔"

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ علامہ اقبال نے نطشے کے نظریات وافکار سے استفادہ تو ضرور کیا ہے لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ اس کا سارا فلسفہ اور تصورِ مردِ مومن نطشے کے افکار اور اس کے "فوق البشر" کے تصور سے ماخوذ ہے۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ رومی کا "مردِ کامل" نطشے کے فوق البشر سے ہم کنار ہو کر اقبال کا "مردِ مومن" بن گیا ہے۔

میں اپنے مضمون کے اختتام پر آل احمد سرور کے تصور میں اقبال نٹشے کے خوشہ چیں ضرور ہیں، مگر نٹشے کی بربریت اور انانیت اقبال کو اپیل نہ کر سکی۔ اقبال کے یہاں چیتے کا جگر اور شاہین کا تجسس بھی نٹشے کے اثر کا پتا دیتا ہے مگر یہاں یاد رکھنا چاہیے کہ اقبال رمز وایما میں صرف تھوڑی سی مشابہت ہی کو کافی سمجھتے ہیں۔ (۱۳)

حواشی:

(۱) پروفیسر آل احمد سرور "حسرت کی شاعری" مجموعہ تنقیدات الوقار پبلی کیشنز ۱۹۸۰ء، ص ۷۰۔
(۲) فریدہ گوہر "اقبال اور نیٹشے" "اقبال نمبر" "ماہِ نو" نومبر ۲۰۰۲ء، ص ۷۴۔
(۳) ایضاً
(۴) پروفیسر آل احمد سرور "اقبال اور اس کے نکتہ چیں" "نئے اور پرانے چراغ، ۱۹۴۶ء، ص ۱۰۳۔
(۵) پروفیسر محمد اکرام سعید "اقبال کا خصوصی مطالعہ"، ۲۰۰۳ء، ص ۳۲۷۔
(۶) ڈاکٹر علامہ محمد اقبال "کلیاتِ اقبال" شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۳ء، ص ۳۳۵۔
(۷) ایضاً، ص ۶۸۶۔
(۸) ایضاً، ص ۶۸۰۔
(۹) "جمہوریت" ایضاً، ص ۶۱۰۔
(۱۰) ایضاً، ص ۱۰۸۔
(۱۱) ایضاً، ص ۳۸۰۔
(۱۲) ایضاً، ص ۳۴۸
(۱۳) پروفیسر آل احمد سرور "اقبال کی عظمت" "ادب اور نظریہ ۱۹۵۴ء، ص ۱۲۰۔

عمرانی نقطۂ نظر سے اقبال کا تصورِ ملّت

بشریٰ لطیف

علامہ اقبال نے ۱۹۱۰ء میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں ایک خطبہ دیا خطبہ انگریزی زبان میں دیا گیا اور اس کا عنوان تھا "Islam as a social and political idea" بعد میں مولانا ظفر علی خاں نے اس تقریر کا اردو ترجمہ "ملت بیضا پر عمرانی نظر" کے عنوان سے کیا۔ علامہ مرحوم کا یہ خطبہ ان کے مخصوص تصورات اور فکر کا آئینہ دار ہے۔

خطبہ کی تمہید میں علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ اگر ہم انسانی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ کائناتِ ارضی میں اَن گنت قومیں پیدا ہوئیں انھوں نے اپنے عروج کا زمانہ پایا اور پھر فنا ہو گئیں۔ آج چند کھنڈروں کے سوا ان کا کہیں نام و نشان باقی نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر عمرانی نقطہ نظر سے قوموں اور ملتوں کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ قوموں اور ملتوں کی حیات عمرانی میں افراد کے انفرادی عمل کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی بلکہ جماعت کے اجتماعی عمل سے جو معاشرہ ظہور میں آتا ہے وہی قابلِ مطالعہ اور قابلِ ذکر ہو سکتا ہے۔ اجتماعی عمل افراد کے انفرادی اعمال کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ یہ قومی و ملی رویے اور کردار کا مظہر ہے ہو سکتا ہے کہ کسی ملت میں کچھ لوگ بہت اعلیٰ کردار و اعمال کے موجود ہوں لیکن اگر اس کا اجتماعی عمل ناقص اور انتہائی ناخوشگوار ہو۔ تو اس قوم کے جملہ افکار و کردار اور امور معاشرت میں اس ناپسندیدہ اور ناقص کردار کا اظہار ہو گا۔ یہ اس لیے کہ کسی قوم کا اجتماعی عمل اس کی تہذیبی زندگی کی روح اور اس کے تمدن کی اساس ہے اور اسی ہیئت اجتماعیہ سے قوموں کا عروج و زوال وابستہ ہوتا ہے اور تاریخ میں اس کی شناخت بھی۔

ان تمہیدی مباحث کے بعد علامہ اقبال کہتے ہیں کہ میں ملتِ اسلامیہ کی عمرانی زندگی یا اس کی تہذیبی روح سے متعلق تین پہلوؤں پر روشنی ڈالوں گا۔

اوّل۔ ملتِ اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی

دوم۔ اسلامی تمدن کی یک رنگی

سوم۔ اس سیرت کا نمونہ جو مسلمانوں کی قومی ہستی کے تسلسل کے لیے لازمی ہے۔

نکتہ اوّل: ملت اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی پر گفتگو کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں اور دنیا کی دوسری اقوام میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ اقبال نے اپنا یہ نقطہ نظر اس شعر سے واضح کیا ہے:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی

اس ترکیب خاص پر علامہ نے جا بجا اظہارِ خیال کیا ہے۔ مغرب کے رائج تصور قومیت سے اقبال کا اختلاف کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں وہ وطنیت کو قومیت کی بنیاد نہیں سمجھتے نہ نسل، رنگ اور زبان ان کے تصورِ ملت میں کسی بھی معنوں میں گنتی شمار میں آئے ہیں۔ علامہ کے نزدیک ملت کی بنیاد عقیدے پر استوار ہے۔ اور ایک عقیدہ رکھنے والے حبشی، عرب، عجمی، ترکی اور ہندی نژاد ایک ملت کے افراد ہوتے ہیں ان کا وطن، ان کی زبان، ان کا رنگ اور ان کی نسل ملت کی تعمیر میں آڑے نہیں آتی۔

کائنات سے متعلق تمام مسلمانوں کا عقیدہ ایک ہے وہ ہے توحید و رسالت پر ایمان۔ جو تاریخی روایات مسلمانوں کو میراث میں ملی ہیں وہ سب کی سب یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کی تہذیب ارتقا پذیر ہے۔ اسلام کی زندگی کا انحصار کسی خاص قوم کے رسوم و رواج پر نہیں ہے۔ اسلامی تہذیب کی بنیاد مذہب پر ہے۔ اگر مذہب نہیں تو کچھ بھی نہیں اسلام زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہے بقول اقبال:

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ

اور یہ اس لیے کہ جس ذات کا وضع کردہ ہے وہ خود زمان و مکاں سے ماورا ہے اس لیے اس کے ماننے والے بھی قیود زماں سے بالاتر ہوتے ہیں اقبال کہتے ہیں:

نکل جا قیود زمان و مکاں توڑ کر

اور اس طرح اسلامی تصورِ قومیت کے تانے بانے توحید سے جا ملتے ہیں اور ملت کا واحد ہونا بھی لازم آجاتا ہے اگر ملتِ اسلامیہ کو جغرافیائی یا نسلی تفریق کے باعث تقسیم کیا جائے تو اس کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے گی اور وہ ملت نہ رہے گی مغربی اصطلاحی قومیت ہو کر رہ جائے گی۔ بد نصیبی سے یہی تصورِ قومیت یورپی اثر سے مسلمانوں میں اس وقت بھی اور آج بھی سرایت کرتا جا رہا ہے۔

ان امور کے ساتھ ساتھ اقبال نے وطنیت اور قومیت کے اس مادی اور محدود نظریے کے باعث انسانی معاشرے میں جو تباہی پھیلتی ہے اس کی بھی وضاحت کی ہے۔ گویا ایک اعتبار سے اپنے نکتہ اوّل میں اقبال نے حضور پر نور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے اس خطبہ مبارک کا خلاصہ پیش کر دیا ہے جو آپؐ نے حجتہ الوداع کے موقع پر انسانیت کو عطا فرمایا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ محض اسی موقع کے لیے خاص نہیں بلکہ اقبال کے افکار کے اکثر پہلو اسلامی تعلیمات کے اسیر ہیں فکر اقبال کی اساس اسلامی ہے بس اقبال نے انداز فکر اپنا اختیار کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے تعلیمات اسلامی کا فکری

نہج سے اظہار کیا ہے اور اپنے فکری نظام میں اس کو اس طرح پیوست کر دیا ہے کہ اسلام اور فکرِ اقبال کا فرق مٹ کر رہ گیا ہے۔

دراصل اقبال کا یہ تجزیہ درست ہے کہ موجودہ مغرب کی تہذیب سوائے چند مادی منفعتوں کے اعلیٰ انسانی اخلاق کی بالیدگی اور بقا کی ضامن نہیں ہے۔ مغرب ہمیشہ سے اتنا بے راہ (اور گمراہ نہ تھا نشاۃ الثانیہ) سے پہلے ان کے معاشرے کی بنیاد بھی مذہب پر تھی لیکن نشاۃ الثانیہ کے بعد مادی ترقی نے اُسے اندھا کر دیا۔ وطنیت اور قومیت کے مادی اور محدود تصور نے اسے انسانیت سے اس حد تک گرا دیا کہ وہ کمزور قوموں کو اپنا غلام اور دست نگر بنائے اور عظیم انسانیت کے اعلیٰ تصور کی توہین کرے۔ مغربی تہذیب نے اگرچہ انسانوں کو کچھ دیا بھی ہے لیکن بحیثیت مجموعی لوٹا زیادہ ہے بقول اقبال:

ساحر الموت نے تجھ کو دیا برگِ حشیش

اور تو ناداں اسے سمجھا کیا شاخ نبات

نکتہ دوم: اسلامی تمدن کی یک رنگی۔ اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ جب ملتِ اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی کا بنیادی عنصر مذہب ہے تو اس کا لازمی نتیجہ اس کے تمدن کی وحدت اور یک رنگی پر منتج ہوگا۔ اقبال کے نزدیک محض اسلام پر ایمان لانا ہی کافی نہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ کے ہر فرد پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ باطن کو یکسر بدل ڈالے۔ اس کا ذہن شائستہ، اس کی فکر بلند و جمیل اور اس کا عمل حسن سے آراستہ ہو وہ علم کا شیدائی ہو اور وہ ساری دنیا کے علمی خزانوں کو تلاش کر کے انھیں نوع انسان میں تقسیم کرنے کا اعلیٰ فرض ادا کرے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے حسن و خوبی سے یہ فرض ادا کیا اور نہ صرف ملت کے تمدن کی یک رنگی کو برقرار رکھا بلکہ اسے کمال کی حد تک آراستہ و پیراستہ کیا۔

اقبال نے مسلمانوں کی تہذیبی و تمدنی زندگی کی یک رنگی سے متعلق تاریخِ اسلام کے حوالے سے ایک اور نکتہ بھی بیان کیا ہے۔ انھوں نے زیرِ نظر خطبے میں فرمایا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی تاریخ پر جس قدر غور کیا جائے اسی قدر یہ تاریخ حیرت انگیز نظر آئے گی۔ اگرچہ ملت اسلامیہ اپنی نمود سے لے کر ہزار سال تک اپنی بقا اور قیام کی جنگ لڑتی رہی لیکن انسانی ارتقا اور علوم و فنون کی اشاعت سے غافل نہیں رہی۔ دنیا کے تمام مذاہب اور قوموں کے علمی کارناموں کے مقابلے میں مسلمانوں کے علمی و سائنسی کارنامے زیادہ ہی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے علم و حکمت کے قدیم خزانوں کو تلاش کر کے باہر نکالا اور مزید اضافہ کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا علوم و فنون کی ترویج کے سلسلے میں مسلمانوں کا یہ رویہ مغرب سے تاشرق روشن اور واضح ہے۔ انھوں نے اپنے خطاب میں اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کا زندہ رکن بننے کے لیے انسان کو مذہبِ اسلام پر بلا شرط ایمان لانے کے علاوہ اسلامی تہذیب کے رنگ میں اپنے آپ کو پوری طرح رنگنا چاہیے۔ صبغۃ اللہ (اللہ کے رنگ) کے دریا میں غوطہ لگانے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان دورنگی چھوڑ کر یک رنگ ہو جائیں اور توحید و رسالت پر ایمان لانے کے تمام تقاضے پورے کریں یہی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ اسلام مسلمانوں کو دین میں پورا کا پورا داخل ہونے کا حکم دیتا ہے جس کا تقاضا بالآخر اسلامی تمدن کی وحدت پر ہی منتج ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ حیات مادی اور روحانی کا انحصار اسی نقطہ پر مرکوز ہے کہ توحید، رسالت اور ختم نبوت کے

تقاضوں اور حکمتوں کو اپنے باطن میں سمویا جائے اور آنے والی نسلوں کو بھی روایت بطور میراث سپرد کی جائے۔

نکتہ سوم: ملتِ اسلامیہ کے لیے ایسی سیرت اورنگ زیب عالمگیر کی ہو سکتی ہے ہمارا خیال ہے کہ اگر فرماں رواؤں میں ہی کسی شخصیت کو نمونہ قرار دینا ہے تو خلافتِ راشدہ سے لے کر عہد مغلیہ تک ایسے افراد اور سیرتیں یقیناً مل جائیں گی جو اورنگ زیب سے زیادہ قابلِ نمونہ بن سکتی ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ اقبال کے ذہن میں اس خطاب کے وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے ماضی قریب کی تاریخ ہو اور اس میں انھوں نے سلاطینِ مغلیہ کے اورنگ زیب کی شخصیت کو ہر اعتبار سے بہتر اور قابلِ تقلید سمجھا ہو لیکن تاریخ میں قریب اور بعید کے واقعات کو صرف اسی قدر اہمیت حاصل ہے کہ وہ تاریخ کے کسی رخ کی نشاندہی کرتا ہو۔ ورنہ بصورت دیگر کسی تجزیہ کے لیے پوری تاریخ ہی کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ اقبال سے ایسی سطحی فکر کی توقع نہیں رکھی جا سکتی اس لیے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمانوں خصوصاً دورِ زوال کے مسلمانوں میں سے کسی شخصیت کی بات کر رہے تھے۔ اور وہ اورنگ زیب کی ہو سکتی تھی کیوں کہ وہ مسلم ہند کے دورِ زوال کی ایک قدر آور شخصیت ہے۔ بہر حال اگر علامہ صاحب کے مخصوص خیالات کو پیش نظر رکھا جائے تو ان کا اورنگ زیب کو قابلِ تقلید نمونہ قرار دینا کسی حد تک قابلِ فہم ہے۔

پاکستان ایک اشرافی ریاست کی معیشت

(ایک تنقیدی جائزہ)

ڈاکٹر عشرت حسین

صفحات: ۷۴۴ قیمت: ۸۰ ؍ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

خصوصی گوشہ

بیاد افتخار احمد عدنی

افتخار احمد عدنی

افتخار احمد عدنی کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۸ میں ادب لطیف میں ان کے مضمون ''گیرودار'' کی اشاعت سے ہوا۔ ۱۹۴۹ میں سلسلہ کچھ اور آگے بڑھا جب اس زمانے کے ایک ہنگامہ خیز تنازعے میں انہوں نے جمیل الدین عالی کے طرفدار کی حیثیت سے جناب عزیز احمد جیسے ادیب کے مشہور افسانوں ''کٹھ پتلیاں'' اور ''درباری'' پر ماہنامہ ساقی میں دو استہزائیہ تحریریں شائع کیں۔ ۱۹۵۰ میں پاکستان کی سول سروس میں شریک ہونے کے بعد افتخار احمد عدنی کا تعلق ادب سے منقطع ہوگیا۔

جسٹس ایم آر کیانی مرحوم کی زندگی کے آخری سال یعنی ۱۹۶۲ میں یہ سلسلہ اس طرح بحال ہوا کہ پاکستان رائٹرز کواپریٹو سوسایٹی کے سیکریٹری کی حیثیت سے ان کی پہلی انگریزی کتاب کی اشاعت کا کام ان کے سپرد ہوا۔ کتاب کی طباعت سے پہلے ہی کیانی صاحب وفات پاگئے۔ ان کی رحلت کے بعد ان کی تمام انگریزی اور اردو تحریروں کی تدوین اور اشاعت کی ذمہ داری انہیں سنبھالنا پڑی۔ اس طرح لکھنے پڑھنے کا تھوڑا بہت انتظام ہوگیا۔

۱۹۷۸ میں وہ نیپا کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ یہ ادارہ چونکہ درمیانی عمر کے سرکاری افسروں کی تربیت سے متعلق ہے اس لئے یہ دیگر سرکاری اداروں کے جان لیوا دستور العمل پہ کاربند نہیں ہے، یہاں کے سازگار ماحول میں غالب کی فارسی غزلوں کا ترجمہ کرنے کا موقع ملا۔ یہ کام آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد افتخار احمد عدنی نے ''اک محشر خیال'' کے عنوان سے اپنی پرانی تحریروں کو ۱۹۸۷ میں شائع کیا۔ اپنے عزیز دوست ظ۔ انصاری کی غیر متوقع وفات سے متاثر ہوکر اپنی یادداشتیں تحریر کرنا شروع کیں جو ظ۔ انصاری کے علاوہ جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی اور بابا ذہین شاہ تاجی سے متعلق ہیں۔ یہ سلسلہ مضامین ۱۹۹۱ سے تقریباً تین سال تک قومی زبان میں جاری رہا۔ اسی دوران کچھ مضامین زندگی کے مختلف گوشوں پر غالب کے اشعار کے حیرت انگیز اطلاق کا تماشہ دیکھ کر لکھے جو ۱۹۹۵ میں ''غالب شناسی کے کرشمے'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔

یادداشتوں کا مجموعہ ''رنگا رنگ بزم آرائیاں'' زیر طبع ہے۔ اسی طرح غالب کے ایک ہزار فارسی اشعار کا اردو ترجمہ ''نقش ہائے رنگ رنگ'' طباعت کے مراحل میں ہے۔

غالب کے فارسی کلام کے اردو ترجمے

افتخار احمد عدنی

اردو	فارسی
یہ جان لو کہ میں کھاتا ہوں جان کر دھوکا	من آں نیم کہ دگر میتواں فریفت مرا
کہ دے وہ شوق سے یوں مجھ کو عمر بھر دھوکا	فریبش کہ مگر میتواں فریفت مرا
وہ حرفِ ذوقِ نگہ ہے نہ مجھ کو کیوں لوٹے	بہ حرفِ ذوقِ نگہ میتواں ربود مرا
کہ بات جس کی فریب اور ہے کہر دھوکا	بہ وہم تابِ کمر میتواں فریفت مرا
مدہوش کرتے ہیں جو صرف ذکر مے سے مجھے	ز ذکرِ مُل بہ گماں میتواں فگند مرا
ثمر کا دیتے ہیں وہ گل کی شاخ پر دھوکا	ز شاخِ گل بہ ثمر میتواں فریفت مرا
مرے فسانے میں ذکرِ غم و محن سُن کر	ز دردِ دل کہ بہ افسانہ درمیاں آید
وہ اس کی جنبشِ سر بھی ہے سر بسر دھوکا	بہ نیم جنبشِ سر میتواں فریفت مرا
شب فراق کی دیکھی ہے کب کسی نے	شبِ فراق ندارد سحر، ولے یک چند
وہ گفتگوئے سحر ہی سے دے مگر دھوکا	بہ گفتگوے سحر، میتواں فریفت مرا
وفا سرشت ہوں، نادان میں نہیں غالبؔ	سرشتِ منٰ بود ایں ورنہ آن نیم غالب
کہ کھاؤں راہِ محبت میں اس قدر دھوکا	کہ از وفا بہ اثر میتواں فریفت مرا

Such is my love that she alone can cast a spell on me a
I make her think that someone else can cast a spell on me

Speak of the joy of gazing, and I am at once your friend
Hint at a supple waist, and you can cast a spell on me

Just speak of wine; you can at once plunge me in fantasy b
I see the fruit; the branch's flower can cast a spell on me

I tell a tale; my own heart's pain is evident in it c
The merest motion of her head can cast a spell on me

The night of parting knows no dawn; yet for a little while
Talk of the dawn; maybe your words will cast a speel on me

True love is in my nature, Ghalib. Even so, no claim
That true love melts a fair one's heart can cast its spell on me

a I do so to arouse her jealousy, and make her more attentive to me.

b. I already experience the joy that is yet to come.

c. I can interpret that as a sign that my story moves her.

Ralph Russell

اردو	فارسی
تجھے ہے وہم نہیں مجھ کو انتظار آجا	زمن اگر نہ بود باور انتظار بیا
بہانہ چھوڑ مری جاں ستیزہ کار آجا	بہانہ جوئے مباش و ستیزہ کار بیا
جفا میں بخل نہ کر میرے دل کی وسعت دیکھ	بیک دو شیوہ ستم دل نمی شود خرسند
ستم کی فوج لیے مثلِ روزگار آجا	بمرگ من کہ بہ سامان روزگار بیا
ہلاکِ شیوۂ تمکیں سے کر نہ مستوں کو	ہلاکِ شیوۂ تمکیں مخواہ مستاں را
حجاب چھوڑ کے اے بادِ نو بہار آجا	عناں گستہ تر از بادِ نو بہار بیا
جو تو نے غیر سے باندھا اسے بھی توڑ صنم	ز ما گسستی و با دیگراں گرو بستی
ہوا ہے عہدِ وفا کب سے استوار آجا	بیا کہ عہد وفا نیست استوار بیا
وداع و وصل ہیں دونوں کی لذتیں اپنی	وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار جدا ہو کے لاکھ بار آجا	ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا
رواج صومعہ ہستی ہے اس طرف مت جا	رواج صومعہ ہستیست، زینہار مرو
متاعِ میکدہ مستی ہے ہوشیار آجا	متاع میکدہ مستیست، ہوشیار بیا

You cannot think my life is spent in waiting? Well then, come! a
Seek no excuses; arm yourself for battle and then come!

These meagre modes of cruelty bring me no joy. By God! b
Bring all the age's armoury to use on me, and come!

Why seek to slay your lovers by your awesome majesty?
Be even more unbridled than the breeze of spring, and come!

You broke with me; and now you pledge yourself to other men
But come! The pledge of loyalty is never kept. So come!

Parting and meeting - each of them has its distinctive joy
Leave me a hundred times; turn back a thousand times, and come!

The mosque is all awareness. Mind you never go that way c
The tavern is all ecstasy. So be aware, and come!

a. The lover tells to come, and see for herself - and this of course ensures that he no longer has to wait!

b. The lover's sufferings are inflicted partly by his mistress and partly by the hard times in which he lives. He says, Add these too to your own aromour. Only if you inflict upon me all the suffering you can shall I know the joy of bearing it.

c. A wareness of the demands of conventional life contrasted with awareness of the things that matter.

Ralph Russell

قطعہ تاریخ — مختار اجمیری

"نکتہ سنج افتخار عدنی"

۲۰۰۴ء

"افتخار عدنی جاہ"

۱۴۲۵ھ

غالب شناس بھی تھے، ادب آشنا بھی تھے
وہ "افتخار عدنی" وہ خوش فکر و خوش خصال
تاریخ نے یہ صنعتِ صوری میں کہہ دیا
۲۰۰۴ء
ہے، "دو ہزار چار"، بہرحال اُن کا سال

کچھ اور کٹھ پتلیاں

افتخار احمد عدنی

"گز گز گز" ہنسی کے ہچکولوں میں کسی نے غضنفر کو مخاطب کیا، "گز" میرے خرگوش، "کیا آج کی شام تم میرے ساتھ گزار سکتے ہو" قہقہوں میں ڈوبی ہوئی جل کی آواز غضنفر کی روح میں اُتر گئی۔ اس پیغام پر ایک لحظے کے لیے اس کا سر چکرا سا گیا۔ جل کی آواز رسیور پر اٹھلا رہی تھی۔ غضنفر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی ٹانگیں بے جان سی ہوئی جا رہی ہیں۔ وہ آہستہ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں"

لیکن خدا بھلا کرے اس کی مصلحت کوشی کا جس نے اسے بے ڈھب پسپائی سے بچالیا۔

شانتی۔ شانتی۔ دیکھو گز اس طرح، 'ہا' ہو جانا ٹھیک نہیں۔ اسد کا انجام مت بھولو۔ اگر خوشی سے تمھارے ہاتھ پاؤں پھول گئے تو سارا کھیل بگڑ جائے گا اور تم نے میری جان فرخندہ نگر میں پاؤں دبانے کے علاوہ سیکھا ہی کیا ہے؟ "کہا جو اس نے ذرا میرا پاؤں" غضنفر نے دانتوں سے اپنے نیچے کے ہونٹ کو دبایا اور بڑی لجاجت سے کہا۔ جل۔ میری شہزادی کیا میں اپنے کانوں پر اعتبار کر سکتا ہوں؟ ٹیلی فون پر قہقہوں کا ایک سیلاب ٹوٹ پڑا۔ Silly Silly کھنکتی دمکتی ہنسی کی لہروں پر لہریں اُمڈنے لگیں۔

"گز، تم ایسے بے اعتبار کیوں ہو گئے۔ بڑے احمق ہو۔ بڑے۔" تھوڑی دیر بعد گنگا جمنی ہنسی کے آبشار گرتے گرتے دفعتاً رک گئے۔ اچھا تو آؤ گے نا۔ گز رات سوا آٹھ بجے میں تنہا تمھارا انتظار کروں گی۔ سوا آٹھ بجے ٹھیک سوا آٹھ بجے سمجھے۔"

رسیور رکھ کر غضنفر نے ایک گہری انگڑائی لی اور میز پر پاؤں جما کے اپنی کرسی کو ہلاتے ہوئے اس پیغام اور ہنسی کو اپنے اندر سمونے لگا۔ "آؤ گے نا گز" گز کی رگ رگ میں انبساط کی موجیں اُٹھنے لگیں۔ رات کو ٹھیک سوا آٹھ بجے میں تنہا، واہ کیا پیچ منجدھار میں مارا ہے بے چاری جل کو۔ غضنفر نے اپنے آپ سے اٹھلانا شروع کیا۔ ٹھیک سوا آٹھ بجے۔ لیکن یہ وقت کی پابندی پر اس قدر اصرار کیوں؟

وقت تنگ است و مردمانِ بسیار

دیکھنا اس مردود نے جو دماغ کے کسی گوشے میں چھپا بیٹھا ہے ایک نشتر لگا ہی دیا۔ اس مردود کے کان مروڑ کر غضنفر جل سے پھر مخاطب ہوا۔

دیکھو جل شرط یہ ہے کہ اس چڑیا کے غلام جیکب کی مداخلت کا کوئی امکان نہ ہو۔ اس دن سالے نے تلفظ کی ذراسی غلطی پر پیسا رگڑا تھا۔ لیکن گز فاختہ کی دم۔ تم نے بھی تو ستم کیا۔ دو تین زبانوں سے برائے نام واقفیت پر آکسونین سے جا الجھے۔ فرخندہ نگر کے بوجھ بجھکڑ کچھ سوچ سمجھ کے ہی تو کہہ گئے تھے:

تیرا ملک دکن تو دکھینچ بول
تجھے کیا پرائی تو اینچھ بول

ماڈلن کا غلط تلفظ رہ رہ کے اس کے دل میں چبھنے لگا۔ کیسی خفت اُٹھانی پڑی اُس دن۔ رفتہ رفتہ اسے اپنی ساری محرومیاں یاد آنے لگیں۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ زندگی اس کے اتنے قریب آکر بھی بے اعتنائی سے گزر جاتی ہے اور وہ بیچارا منہ تکتا رہ جاتا ہے۔ آنکھیں بند کر کے اس نے فال نکالی۔ انگلیاں ایک دوسرے سے مل گئیں۔ ٹھیک ناخن پر ناخن۔ اس کے ڈوبتے ہوئے دل کو تنکے کا سہارا مل گیا۔ تنکے کا کیا انگلیوں کا اور پھر انگلیوں سے پہنچے تک پہنچنا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔ گزا تنے تنگ دل نہ بنو۔ زمانے کا بہاؤ دیکھو۔ وقت کا مزاج سمجھو۔ یہ رقابت کا جذبہ تو جاگیر داری دور کی ایک روایت ہے۔ دلّی کے دارالحکومت میں تھوڑی دیر کے لیے فرخندہ نگر کو بھول جاؤ اور پھر آج تو اس نے صرف تمھیں مدعو کیا ہے۔ تمھیں پریشانی کیا ہے؟ غضنفر کے دل نے ایک کسک کے ساتھ کہا:

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے

خوفِ رقیب پر تین حرف۔ لیکن اس سہ حرفی لعنت کے باوجود اس کا اضطراب بڑھتا ہی گیا کاش اس وقت زریں تاج سے کوئی کہہ دیتا کہ اس کا غضنفر کس مشکل میں گھرا ہے۔ بڑی دیر تک ایک سخت کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد اس کے دل کو ایک طرح کا سکون سا ہو گیا۔ اس نے وصال کی شام، شام نہیں وصال کی دہلیز پر کھڑے ہو کر اپنے بدن کو تیاگ دیا تھا ایک دائمی شکست اور محرومی کے لیے آمادہ ہو کر اس نے جل کو بڑی دردمند آنکھوں سے دیکھا اور اس کا ہاتھ جیکب کے ہاتھ میں دے دیا۔ جل میرے لیے یہ حسرت ہی کافی ہے۔

"اگر آں نکوست تو در خوری و گر ایں بدست مرا سزا"

گھڑی پر نظر پڑی تو اسے یاد آیا کہ اسے ناشتہ کیے ہوئے پورے ساڑھے چار گھنٹے ہو چکے ہیں۔ آنتوں کی چکی میں غذا کا ایک ایک ذرہ پس چکا ہوگا۔ وہ اٹھا اور آئینے میں اپنی حسرت کا جائزہ لینے لگا۔

یہ شکستِ خوردگی کہیں صرف بھوک ہی کا تو نتیجہ نہیں تھی، وہ کیوں جل کا ہاتھ جیکب کے ہاتھ میں دیدے۔ وہ خود اسے اپنانے کی کوشش کیوں نہ کرے۔ زندگی ایک مقابلہ ہی تو ہے۔ لیکن اس مقابلے میں کامیابی کی پہلی شرط یہ ہے کہ آنتیں خالی نہ رہیں۔ یہ سوچتا ہوا غضنفر کھانے کے کمرے کی طرف چل دیا۔

کھانے کے بعد غضنفر کے جسم اور تمناؤں میں ایک توانائی آگئی۔ یہ لوگ آخر کس طرح بدن کو مار کر روح کو بیدار کرتے ہیں۔

بھلا بدن کی نفی سے بھی کہیں بات بنی ہے۔ تپسیا میں اپنے جسم کو گھلا کے بدھ کو نروان کے خلا کے علاوہ اور کیا مل سکتا تھا۔ بیچارہ بدھ، کاش اس نے ایک بار امپیریل میں شکم سیر ہو کر کھانا کھالیا ہوتا اور اس کی بیوی کپل وستو کے راجہ کی ارمانوں سے بیاہی ہوئی بہو۔ وہ غریب بھی تو۔ یہ زرین تاج کی کہانی بھی کس قدر پرانی ہے۔ مدن سینا کے وقت سے یہی ہوتا چلا آیا ہے اور نہ جانے کب تک یہی ہوتا رہے گا۔ ہاں تو جل میں ٹھیک سوا آٹھ بجے تمھارے پاس آؤں گا۔ تم تنہا میرا انتظار کر رہی ہوگی نا۔ جل میری شہزادی، میری مسٹریس۔ یہ مسٹریس کا لفظ بھی کتنا اچھا ہے۔ زچہ روالست بر بکم نرنی بزن کہ بلی بلی۔ یہ سوچتے ہوئے غضنفر نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ اچھا ایک شیونہ کرنے سے یہ حال ہو گیا "اُگ رہا ہے درودیوار سے سبزہ غالب" اور پھر وہ بڑھتے ہوئے بالوں کی چھوٹی بے شمار نوکوں سے اپنی ہتھیلی کو کھجانے لگا۔ آج وہ پوری طرح آرام کر رہا تھا۔ شیو کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ رات گئے رخصت ہوتے وقت بڑی خانزادی نے از روئے مرحمت یہ کہہ دیا تھا کہ کل تمھیں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ غضنفر اپنی ہتھیلی کو کھجاتے کھجاتے رک گیا۔ یہ چہرے کے بال بھی کس قدر مہمل چیز ہیں۔ جانوروں میں نر کس قدر ممتاز ہوتا ہے۔ مرغ کے سر پر تاج ہوتا ہے۔ مور کی بڑی سی دم ہوتی ہے۔ شیر کے عیال، لیکن عیال تو شاید گھوڑے کے بالوں کو کہتے ہیں اور ہرن کے سینگ ہوتے ہیں۔ ہرن کے سینگوں پر غضنفر رک گیا۔ اگر اس کے اپنے سر پر خوبصورتی سے بل کھائے ہوئے سینگ ہوتے تو وہ آہستہ سے جل کے بدن میں گڑا کے گدگدی کرتا اور جل اپنے قہقہوں کے ساتھ سلی اسنوپڈ کہتے ہوئے دوہری ہو ہو جاتی اور پھر وہ اس کے بکھرے ہوئے بالوں کی لٹوں کو اپنے سینگوں سے الٹ دیتا ہے اور اس سالے جیکب کے جسم کو تو وہ سینگ مار مار کے چھلنی کر دیتا اگر اس کے صرف دو سینگ ہوتے تو زندگی کس قدر مختلف ہوتی اور مرد بیچارے کے صرف بال ہوتے ہیں۔ ان داڑھی کے بالوں سے اور وہ بھی جب ان کی عمر صرف چھتیس گھنٹے ہو کیا کام لیا جا سکتا ہے سوائے اس کے جل کے چہرے کو جھانوے کی طرح رگڑ کر رکھ دیا جائے لیکن اس میں بھی کیا برائی ہے۔ شاید یہ بال ہوتے ہی رگڑنے کے لیے ہیں۔ قدرت کی یہ منطق غلط نہیں ہو سکتی۔ جنسوں کے ٹکراؤ میں مرد کی برتری کا انحصار ممکن ہے صرف چبھونے اور رگڑنے پر ہی ہو۔ تنازع للبقا میں داڑھی ہی تو مرد کا ایک ہتھیار ہے۔ اس داڑھی کو اگانے کے لیے مرد نے کتنے ہزار سال غیر شعوری طور پر ارادہ کیا ہو گا۔ تب کہیں جا کے چہرے کے مساموں سے بالوں کی نوکیں پھوٹی ہوں گی تو گویا داڑھی مرد کی ہزارہا سال کی کمائی ہے۔ اس سے انکار زندگی کے ارتقا سے انکار ہے۔ چھلا ہوا چہرہ تو ایک مہذب تضاد ہے۔ نہیں اسے قدرت کا ساتھ دینا چاہیے۔ اچھا تو آج رات وہ جل کے چہرے کو رگڑ رگڑ کے لہولہان کر دے گا۔ غریب جل۔

پونے سات بجے تک وہ پوری قوتِ ارادی کے ساتھ اپنی داڑھی کو اگاتا رہا۔ چوں کہ داڑھی ہی تو مرد کا ایک طرۂ امتیاز ہے۔ لیکن ٹھیک پونے سات بجے وہ اپنے فیصلے کو بدلنے پر مجبور ہو گیا۔ جس تمدن میں چھلا ہوا چہرہ سکۂ رواں کی طرح چلتا ہو وہاں داڑھی پر اصرار کرنے کے لیے شہیدوں کی سی ہمت چاہیے۔ اسے بھلا شہید ہونے کی کیا ضرورت پڑی ہے۔ اور وہ بھی جل جیسی ستم ظریف کے لیے تصورِ شیخ میں گم ہو کر البتہ وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ ایک عقیدت مند مرید نے تو صرف اپنی بیوی شیخ کی خدمت میں نذر کی تھی وہ تو جوشِ عقیدت میں نہ جانے کیا کر گزرتا۔ لیکن اس کی بدنصیبی کہ اسے ایک طرحدار مرشد تک میسر نہ آسکا۔ جب اپنے دل سے

اٹھتے ہوئے ارادت کے طوفان سے مجبور ہو کر وہ زرتشت سے فریاد کرتا۔ او ایرانی پیغمبر، میں اس نیاز کو کس آستانے پر بھینٹ چڑھاؤں تو آواز آتی روحانیت کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے ہیں۔ جا مایا کی پوجا کر۔ مایا ہی میں تیری مکتی ہے۔" جب پارسیوں کے زردار فرقے کا پیغمبر زرتشت یہ کہتا تو غضنفر کے سامنے زرد گوہر سے بھرے طشت ناچنے لگتے۔ یوں کہا زرتشت نے۔ یہ سوچتے ہوئے غضنفر نے اس زور سے شیو کرنا شروع کیا جیسے وہ بالوں کی جڑوں تک کو صاف کر کے رکھ دے گا۔

شیو کے بعد غضنفر کے دل سے غبار چھٹ گیا اور جب وہ نہا کر نکلا تو طبیعت اس قدر شگفتہ تھی کہ وہ اپنی محبوب دُھن، لاری لپا، گنگنانے لگا۔ واہ غضنفر ڈیڑھ دن کے بعد شیو کر کے تم تو خوب نکھر گئے، اب پیارے خوشبو میں ڈوب جاؤ ملن کی رات ہے۔ سمجھے۔ لاری لپا لاری لپا لائی رکھدا، اور دیکھو ٹائی ذرا سلیقے سے باندھنا۔ واہ کیا گرہ ڈالی ہے۔ 'اڈی ٹپا، وہ مارا جل کو، اڈی ٹپا، اڈی ٹپا لائی رکھدا۔ دیکھا تم نے اپنی خوش خیالیوں میں کتنا وقت ضائع کر دیا۔ اب جلدی کرو جلدی۔ وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی۔ اور تم یونہی ہاتھ ملتے ہوئے رہ جاؤ گے۔

ٹھیک آٹھ بج کر تیرہ منٹ پر غضنفر کی موٹر جل کی مہتابی میں رُکی۔ برآمدے میں ایک باراں دیدہ قسم کا نوکر اس کا منتظر تھا جس نے اس کا جائزہ لے کر استفسار کیا، "گز صاحب" اچھا تو وہ ظالم اپنے نوکروں سے بھی مجھے گز ہی کہتی ہے۔ غضنفر نے تھوڑی سی ناگواری کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا تو نوکر نے اسے بتایا کہ میم صاحب کی طبیعت کچھ خراب ہے اس لیے وہ اپنے بیڈ روم ہی میں ہیں اور انھوں نے تاکید کر دی تھی کہ گز صاحب کے آتے ہی انھیں فوراً ان کے پاس لے آیا جائے۔ جل کے بیڈ روم میں، خواب گاہ میں، شبستاں میں، زندگی گریٹا گاربو بن کے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ ہاتھ پھیلائے، بال بکھرائے، ایک سپردگی کے عالم میں۔ دوپہر بھر وہ یہ سوچتا رہا تھا کہ وہ کس طرح پیش قدمی کرے گا۔ اس نے بہت سے خاکے ذہن میں بنا بنا کے بگاڑے تھے۔ آخر میں اس نے یہ طے کیا تھا کہ وہ جاتے ہی کشادہ جبینی کی فضا پیدا کر دے گا۔ کچھ عمر خیام کی رُباعیاں، کچھ وینس کے مجسمے اور مونالیزا کا ذکر کچھ آکسفورڈ اور ادب کی باتیں۔ اس لطیف سی آمیزش سے رات کا نشہ اور بھی نکھر آئے گا لیکن یہاں تو زندگی ایک دم دو ضرب دو چار ہو کے سامنے آ گئی تھی۔ ایک گلاس پانی، ڈوبتے کو پانی کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ جب ذرا پانی پی کے اس کا دل ٹھکانے سے ہوا تو وہ نوکر کے پیچھے پیچھے جل کے بیڈ روم کی طرف چلا۔ نوکر نے دستک دی یہ جل کی خواب گاہ ہے گز۔ جل کی خواب گاہ، خواب گاہ کا لفظ سیماب کی طرح اس کے سر میں چکرا کے اس کے خون میں حل ہو گیا۔ اس نے اپنے بدن میں ایک گرمی اور توانائی محسوس کی۔ بڑھ کے دستک دو۔ کیا دیکھ رہے ہو؟ غضنفر نے دستک دی۔ ذرا دیر کے بعد جل نے مضمحل سے انداز میں دروازہ کھولا اور مسکرا کے غضنفر کو اندر بلا لیا اور پھر وہ دروازہ بند کر کے سنگار میز کے سامنے اسٹول پر بیٹھ کر خواہ مخواہ اپنے بالوں کو ٹھیک کرنے لگی۔ غضنفر سنگار میز اور مسہری کے درمیان آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ گلابی رنگ کے کمرے میں ایک بڑی نشہ آور سی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ مسہری کے قریب ایک میز پر ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔ جس کے شیڈ نے دیواروں کو سائے اور روشنی میں ایسے بانٹ دیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا جیسے سارا کمرہ آنکھ مار کے کسی بہت ہی ایسی ویسی بات پر اکسا رہا ہو۔ فرطِ جذبات سے غضنفر کا دل گھٹنے لگا۔ اس نے جل کے قریب جا کے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں

لے لیا۔ جب جل کے ہاتھ نے کوئی مزاحمت نہ کی تو اس نے فرش پر بیٹھ کر انگلیوں کو چومنا شروع کر دیا۔ جل نے محظوظ ہو کے ہنسنا شروع کر دیا۔ ''سلی یہ کیا بدتمیزی ہے گز۔ ''غضنفر نے اپنے چہرے کو جل کے گھٹنوں پر رکھ کر کیف میں آنکھیں بند کر لیں۔ اور اپنے ہاتھوں کو اس کی کمر میں حمائل کر دیا۔ ج تمھیں آکسفورڈ کا وہ زمانہ یاد ہے۔'''' اوہ گز تم اس قدر جذباتی کیوں ہوئے جا رہے ہو۔ ''جل نے مصنوعی بیزاری سے کہا اور غضنفر کے بالوں کو سہلانے لگی۔ غضنفر نے جل کے گھٹنوں میں ڈوبتے ہوئے سوچا بغیر کسی کشادہ جبینی کے سارے مراحل طے ہو گئے۔ مجھے ہر چیز کتنی دشوار لگ رہی تھی۔ یہ کمرہ، یہ وقت، یہ مہک اس وقت تو جل کے زانو پر جان بھی دی جا سکتی ہے۔ محبت کے درد میں ڈوب کر غضنفر نے جل کو بڑی مجروح نگاہوں سے دیکھا I die, I faint, I fail! اس مصرعے کے جواب میں جل نے غضنفر کے کانوں کی لو کو ہاتھ میں لے کر اس زور سے مسلا کہ اس کے دونوں کان سرخ ہو گئے۔ اس حرکت پر غضنفر نے استفسار آمیز آنکھوں سے جل کی طرف دیکھا تو اس نے کہا ''تمھیں ہوش میں لانے کے لیے۔''

''اور اگر میں ہوش میں نہ آؤں تو۔ ''غضنفر نے پھر اپنا چہرہ جل کے زانو پر رکھتے ہوئے کہا۔ تو، جل نے دونوں ہاتھوں سے غضنفر کے کان پکڑ لیے۔ اور آہستہ آہستہ مسلتے ہوئے بولی۔ ''تو میں بلّی کی طرح تمھاری ناک پر کاٹ کھاؤں گی۔ ''غضنفر نے جل کے ہاتھوں کو اپنے کانوں سے الگ کرتے ہوئے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ''تو پھر تم نے مجھے اس وقت کمرے میں کیوں بلایا تھا۔ ''جل نے استہزا اور پیار کے ملے جلے لہجے میں کہا۔ تم سے فرخندہ نگر کے مزے دار قصے سننے کے لیے۔ ''جل کا لہجہ غضنفر کے دل میں کھٹکا اور اس نے ناگواری کے ساتھ پوچھا۔ ''اچھا تو تم مجھے قصہ گو سمجھتی ہو، ''قصہ گو سے بھی بڑھ کر، تم تو اس سنگ مرمر کی مورت کے مصاحب ہو۔ ''غضنفر کچھ برہمی کے ساتھ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''اچھا گز یہ تو بتاؤ تم نے کبھی اپنی خانزادی سے فلرٹ بھی کیا ہے۔؟''

''خانزادی کو اپنا سا نہ سمجھو''، غضنفر نے بے رخی سے ٹہلتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم تو واقعی خفا ہو گئے گز۔ ''جل سنگار میز کی طرف پیٹھ کر کے غضنفر کی طرف مڑ گئی۔ ''بات یہ ہے کہ میں فرخندہ نگر کے حالات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہتی ہوں تاکہ فیصلہ کرنے میں ہمیں کوئی دشواری نہ ہو۔ تم سے بہتر فرخندہ نگر کے حالات سے کون واقف ہو گا۔ اب تم بغیر وقت ضائع کیے ہوئے فرخندہ نگر کی زندگی کا ایک خاکہ کھینچ دو۔'''' تمھارا مطلب کیا ہے''، غضنفر نے ذرا متعجب ہو کر پوچھا، ''مطلب یہ ہے کہ ہمارے فرخندہ نگر جانے کا خاصا امکان پیدا ہو گیا ہے''، اس انکشاف پر غضنفر ٹہلتے ٹہلتے ایک دم رُک گیا۔ ''صدارت عظمیٰ پر؟'' یہی سمجھ لو، جل نے بڑی کافرانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ غضنفر کے بدن میں زندگی کی ایک شدید لہر آئی اور اس کی آنکھیں بے شمار امکانوں سے یک دم چمک اٹھیں۔ اس نے فرطِ طرب میں جل کے کاندھوں کو ہلا کر کہا۔ اسے کہتے ہیں کہ بیک کرشمہ دو کار، غضنفر نے سوچا، ''اگر صدارتِ عظمیٰ، بلکہ صدارتِ عظمیٰ کا محور، کسی کی گرفت میں آ جائے تو پھر ہاتھ کی سب لکیریں رگِ جان بن جاتی ہیں۔ فرخندہ نگر کی ولایت اسی کے حصے میں لکھ دی جاتی ہے۔ ''تو پھر پوچھو تمھیں کیا پوچھنا ہے۔ ''ٹھہرو گز۔ ابھی ایک مرحلہ باقی ہے۔ حکومت ہند کا تو یہی ایما ہے کہ ہم لوگ فرخندہ نگر جائیں لیکن ابھی یہ نہیں معلوم کہ تمھارے خانِ حضرت کا اس بارے میں کیا فیصلہ ہو گا۔ آج کل وہ اس سلسلے میں حکومتِ ہند سے خط و کتابت کر رہے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم کسی طرح فرخندہ نگر سے اس خط و کتابت کی نقل حاصل

کر کے ہمیں پہنچادو۔""""غضنفر خاموش ہو کر ٹہلنے لگا جل نے تھوڑی دیر بعد پوچھا، کام بہت کٹھن ہے کیا؟" غضنفر نے مسکراتے ہوئے کہا، "ہاں، ہے تو لیکن میری صلاحیتوں کے آگے ذرا بھی مشکل نہیں۔ میں نے سیکڑوں مسودے اُڑائے ہیں۔ ہزاروں دستاویزیں گم کی ہیں۔ اس خط وکتابت کی نقل حاصل کرنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے تم مطمئن رہو۔" "اچھا تو اب فرخندہ نگر کے بارے میں کچھ مزیدار باتیں سناؤ۔" جل نے اپنے بالوں کو جھٹکادیا۔ اور ہتھیلی پر تھوڑی لگا کر ہمہ تن توجہ بن گئی۔ غضنفر نے اپنی تمام بیانیہ قوتوں کو مجتمع کیا اور اپنے نظریوں کو تول کر فرخندہ نگر کی زندگی کی تصویر کھینچنی شروع کی۔ جب وہ اپنے انہماک اور تجزیوں کی رو میں بہتا ہوا بہت دور نکل گیا اور ساڑھے آٹھ بجنے میں صرف تین منٹ رہ گئے تو جل آہستہ سے اسٹول پر سے اُٹھی اور غضنفر کی طرف رُخ کر کے اپنے پلنگ پر نیم دراز ہو گئی۔ اس نے اپنے بالوں کی کچھ لٹوں کو اپنے چہرے پر ڈال لیا اور گہرے گہرے سانس لے کر اپنی خوشبو کو خود سونگھنے لگی۔ غضنفر کا انہماک ٹوٹنے لگا لیکن پھر بھی وہ اپنی توجہ کے ٹکڑوں کو جوڑتے ہوئے کہتا رہا، "ریذیڈنٹ کے جاسوس صدرِاعظم کے ہاں لگے ہوئے ہیں۔ صدراعظم کے جاسوس خانِ حضرت کے ہاں اور خان حضرت کے جاسوسوں کی ایک زنجیر ہے۔" جل نے اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے بڑی مخمور نگاہوں سے غضنفر کی طرف دیکھا۔ اور تم بھی تو ایک جاسوس ہی ہو۔ جو میرے دل کے بھید لینے کے لیے میری خواب گاہ میں آگئے ہو۔" اس جملے پر غضنفر کا سر چکرا گیا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے زمین اس کے قدموں کے نیچے سے نکل گئی۔ وہ جل کے پلنگ پر بیٹھ گیا اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بہکی بہکی نظروں سے دیکھنے لگا۔ جل نے ایک ثانیے کے لیے اس کو بڑی مست نظروں سے دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ غضنفر نے اس کے ہاتھ کو دبایا اور کہیں بہت دور سے کہا۔ "جل" جل تکیوں پہ سے تھوڑا سا ڈھلک کے اور نیچے ہو گئی اور شہزادیوں کے سے انداز میں بولی۔ "مانگو گز، کیا مانگتے ہو؟ تمھاری ہر مراد پوری کی جائے گی۔" غضنفر کا جسم مدہوش سا ہونے لگا، "صرف ایک مراد ہے جل"، "جاؤ ہم نے اسے پورا کیا۔" احساس کی لطافت میں ڈوبتے ہوئے غضنفر نے کہا، "بس ایک یہ مراد ہے کہ تم مجھے جیک کہا کرو"، اس جملے کے سنتے ہی جل کی ساری وارفتگی یکلخت کافور ہو گئی اور اسے ہنسی کا ایک بے تحاشا دورہ پڑ گیا۔ "جیک جیک جیک ایڈیٹ" ہنسی کی بارش، کھنکتی ہوئی ہنسی کی موسلادھار بارش اور بیچ میں اسٹوپڈ اور سلی کی بجلیاں۔ جب کچھ دیر بعد بارش کا بادل چھٹ گیا تو جل نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "گز مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ تم اتنے احمق ہو گے۔" ہنسی اور تضحیک کے اس طوفان کے باوجود غضنفر اسی طرح اپنے کیف میں گم تھا۔

"جیک اینڈ جل وینٹ اَپ دی ہل۔ "ٹو فیچ اے پیل آف واٹر،" کسی آسمانی المیے کے ہیرو کی طرح اس نے اپنی آواز بلند کر کے اس طرح پڑھنا شروع کیا۔ جیسے اس کے الفاظ ساری کائنات پر ایک جادو کریں گے۔ جل سے ہنسی کی پھوار ضبط نہ ہو سکی۔ اس نے ہنستے ہوئے جیک کا انجام یاد دلایا، "جیک فیل ڈاؤن اینڈ بروک ہر کراؤن" غضنفر نے بڑی قطعیت کے ساتھ اسی آسمانی انداز میں کہا۔ "اینڈ جل کیم ٹمبلنگ آفٹر، جل اگر میرے پیچھے تم لڑھکتی ہوئی چلی آؤ تو مجھے کسی چیز کا کوئی غم نہ ہو گا" اور یہ کہہ کر وہ پلنگ سے نیچے اتر کر جل کو اپنے اوپر لڑھکانے کی کوشش کرنے لگا۔ جل نے اسی طرح ہنستے ہوئے غضنفر کے بال پکڑے اور کہنے لگی۔ جیک گز میرے خرگوش، اس طرح وقت کو ضائع نہ کرو... ابھی تھوڑی دیر میں شاید، غضنفر گھبرا کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ نہیں۔ نہیں۔ ابھی نہیں۔ ابھی تو

بہت سے استعارے باقی ہیں۔ کتنی ادبی تلمیحیں یونہی رہ جائیں گی۔ جل نے ایک زہر خند کے ساتھ کہا۔ ایڈیٹ۔ غضنفر کے دماغ میں ایک بجلی سی کوند گئی۔ واقعی وہ کس قدر زرّیں موقع کو ضائع کر رہا تھا کتنا قیمتی وقت برباد ہوا جا رہا تھا۔

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز

"جل میری گڑیا ابھی ان ساری حماقتوں کی تلافی ہوئی جاتی ہے۔"

"تلافی"۔ جل نے بہت معنی خیز انداز میں کہا اور تیزی سے مسہری سے اُٹھی اور الماری کا پٹ کھول کے نہ جانے کس چیز میں مصروف ہو گئی۔ غضنفر اس کے تکیوں کے سہارے لیٹے ہوئے سوچنے لگا۔ ارے گز گدھے کی جھول یہ تمھیں کیا ہو گیا تھا۔ کوئی اس طرح بھی موقعوں کو غارت کرتا ہے۔ خیر اب بھی کچھ نہیں گیا۔ چلو جلدی کرو:

ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

آدھ منٹ ہی گزرا ہوگا کہ غضنفر نے بے تاب ہو کر جل کو آواز دی، جل یہ تم کیا کرنے لگیں۔ ابھی آئی جل نے الماری کے پٹ کے پیچھے سے کوکتے ہوئے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد جل اٹھلاتی ہوئی مسہری تک آئی لیکن اس سے پہلے کہ غضنفر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے اس کے کانوں نے بیڈ روم کی طرف بڑھتے ہوئے بھاری قدموں کی چاپ سنی خطرے کے فوری احساس سے اس کا سارا بدن جھنجھنا گیا۔

دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ

یوں کہا زرتشت نے اور ایک قلابازی کھا کے غڑاپ سے مسہری کے اندر گم ہو گیا۔ غضنفر گھبرا کے اُٹھ بیٹھا۔ "کون ہے جل"۔ جل نے ذرا بد حواس ہوتے ہوئے کہا۔ "اب کیا ہو گا گز" بجلی کی طرح غضنفر پلنگ سے اُٹھا۔ اسے کہاں چھپنا چاہیے۔ پردے کے پیچھے، مسہری کے نیچے یا الماری کے اندر۔ دروازے پر بہت سی داخلہ طلب قسم کی دستک ہوئی غضنفر بے اختیار ہو کر الماری کی طرف بڑھا لیکن جل نے کان پکڑ کر اسے روک لیا اور اسٹوپڈ کہہ کے آہستہ آہستہ اس کا کان مسلتی ہوئی غسل خانے کی طرف لے چلی۔ دوسری دستک کے ہوتے ہوتے اس نے غسل خانے کا دروازہ کھولا اور ایک چپت جما کے غضنفر کو اندر دھکیل دیا۔

غسل خانے میں داخل ہوتے ہی غضنفر حیرت سے مبہوت رہ گیا۔ چھوٹتے ہی اس کی نظر سامنے والی کھڑکی پر پڑی جہاں دبیز مدھم شیشوں سے لگے نواب مطمئن جنگ بیٹھے تھے معہ اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور خمیدہ کمر کے۔ مطمئن جنگ بغیر غضنفر سے نظریں ملائے اس کی پریشانی کا جائزہ لینے لگے۔ غضنفر حیران تھا کہ اُن سے کہے تو کیا۔ اتنے میں کسی نے برابر سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "چلو اس حمام میں ایک ننگے کا اور اضافہ ہو گیا" غضنفر نے مڑ کر دیکھا تو بڑے خانزادے کا خاص مصاحب شفیع اس کے برابر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ شفیع کے اس جملے پر نواب مطمئن جنگ کسمسا کے دوسری طرف دیکھنے لگے۔ ان نودولتیوں کے ساتھ ننگا ہونا ان کے لیے کسرِ شان تھا۔ یہ بھی قسمت کا پھیر تھا کہ وہ ان لونڈوں کے ساتھ ایک ہی حمام میں بند ہو گئے تھے۔ غضنفر کو کسی طرح اپنی آنکھوں پر

یقین نہیں آتا تھا۔ اس نے حیرت سے پوچھا ''شفیع تم بھی یہیں'' شفیع نے کہا۔ ''میں تو ہوں ہی۔ اب دیکھو اور نہ جانے کون کون آتا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے اب کے کہیں جیکب کا نمبر نہ ہو۔'' غضنفر کی درباردار طبیعت نے فوراً محسوس کیا کہ شفیع کی باتیں نواب مطمئن جنگ کو ناگوار گزر رہی ہیں۔ وہ اس کا ہاتھ دبا کے غسل خانے کے دوسرے کونے میں لے گیا اور سرگوشی کے انداز میں پوچھنے لگا، ''یار یہ ہے کیا ماجرا؟''

شفیع نے آہستہ سے کہا، ''قسم ہے خان حضرت کی۔ میں نے ایسی چھٹی ہوئی عورت نہیں دیکھی۔ دل کھول کے بنا رہی ہے ہم سب کو۔'' غضنفر نے سگریٹ کیس کھول کر ایک سگریٹ شفیع کی طرف بڑھایا اور ایک خود سلگایا اور اس صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ شفیع نے بالٹی الٹی کی اور اس پر بیٹھ گیا۔ غضنفر نے کموڈ کا ڈھکنا نیچے گرا کے اپنے لیے نشست بنالی۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد غضنفر نے پوچھا، ''پہلے کون یہاں آیا؟ تم یا مطمئن جنگ؟'' ''مطمئن جنگ''، شفیع نے جواب دیا۔ اس سے کوئی بات بھی ہوئی۔'' ''ہاں میں نے آتے ہی پوچھا کہ ان پر کیا گزری'' ''تو انھوں نے کیا بتایا؟''، ''یہی کہ پہلے تو نوکران کا منتظر تھا اور وہ انھیں میم صاحب کے بیڈروم میں لے آیا اور پھر یہ کہ میم صاحب نے بڑی سنجیدگی سے ان سے کہا۔ نواب صاحب مجھے آپ سے ایک نہایت اہم معاملے میں مشورہ کرنا ہے۔ اس لیے آپ کو تکلیف دی ہے۔ بات یہ ہے کہ بڑے خانزادے نے مجھے تین مہینے اپنے محل میں رہنے کے لیے مدعو کیا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ فرخندہ نگر کے لوگ بڑے تنگ نظر ہیں۔ میرے وہاں جانے سے نہ جانے کیا پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں۔ اس لیے آپ بتائیں کہ میں یہ دعوت قبول کرلوں یا نہیں۔ مطمئن جنگ اس سوال پر بہت چکرائے کہ اگر وہ مخالفت کریں اور یہ بات خانزادے تک پہنچے تو ایک مشکل ہو جائے گی اور اگر دعوت قبول کرنے کا مشورہ دیں تو خان حضرت اور بڑی حضرت خانزادی کو کیا جواب دیں گے۔ وہ بہت دامن بچا کر گول مول باتیں کرتے رہے۔ جب میرے آنے میں صرف چار، پانچ منٹ رہ گئے تو اس بلانے ایک دم ان کے گلے میں ہاتھ ڈال دیے۔ اور چٹاچٹ سیکڑوں پیار لے ڈالے اور بولی کہ نواب صاحب۔ اگر میں فرخندہ نگر گئی تو صرف آپ کی وجہ سے جاؤں گی۔ آپ میرے باپ سے اس قدر ملتے ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ بس آپ کو دیکھتی اور پیار کرتی رہوں۔ یہ کہہ کر وہ مطمئن جنگ کی خمیدہ کمر پر ہاتھ پھیرنے لگی اور بولی۔ میرے باپ کی کمر بھی آخر میں بالکل اسی طرح جھک گئی تھی کتنی پیاری اور شفیق کمر ہے آپ کی۔ تھوڑی دیر تو وہ اسی طرح ان کی کمر کو ملتی رہی اور پھر اس نے یہ ضد شروع کی کہ جیسے میں اپنے باپ کی کمر کو بغیر کسی کپڑے کے پیار کرتی تھی۔ اسی طرح آپ کی کمر کو پیار کرنا چاہتی ہوں۔ اس نے اس قدر ضد کی کہ بیچارے مطمئن جنگ شیروانی، قمیض اور بنیان اتارنے پر مجبور ہوگئے۔ کمال یہ ہے کہ دستار وہ اس کے باوجود بھی پہنے رہے۔ جب وہ صرف پاجامے اور دستار میں رہ گئے تو کبھی وہ ان کی کمر سے اپنا چہرہ اور آنکھیں ملتی اور کبھی پیار کرنے لگتی۔ اتنے میں میں نے دستک دی مطمئن جنگ گھبرا گئے کہ اگر کسی نے اس طرح بغیر قمیض بنیان کے انھیں دیکھ لیا تو کیا کہے گا۔ اس لیے وہ اپنے کپڑے سنبھال کر غسل خانے میں گھس آئے۔'' غضنفر نے یہ سب سن کے کہا۔ ''مجھے حیرت یہ ہے کہ انھوں نے یہ سب تفصیلات تمھیں بتائیں کیسے؟'' ''اگر وہ نہ بتاتے تو میں سمجھتا کہ وہ بھی یہاں کسی اور ہی مقصد سے آئے تھے۔ اس لیے انھوں نے بہتر یہی سمجھا کہ سب کچھ بے کم و کاست

سنا دیں۔" غضنفر نے ایک اور سگریٹ جلاتے ہوئے کہا، "اچھا اب یہ بتاؤ شفیع کہ تم کہاں تک پہنچے تھے۔ "میں تو بڑے نازک مقام تک پہنچ گیا تھا۔ آتے ہی اس نے مجھ سے یہ کہا کہ خانزادے نے مجھے شکار کے لیے مدعو کیا ہے۔ مجھے ہندوستان کے جنگلوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ تم اکثر خانزادے کے ساتھ شکار میں رہے ہو گے۔ یہ بتاؤ کہ کیا واقعی یہاں کے جنگل اتنے بھیانک ہوتے ہیں جتنا میں نے سنا ہے۔ میں بڑی دیر تک سنجیدگی سے شکار کے بارے میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ جب تمھارے آنے کا وقت ہوا تو وہ ظالم سنگار میز کے اسٹول سے اُٹھ کر اپنے پلنگ پر لیٹ گئی اور بولی شفیع شکاری تو تم بھی بڑے غضب کے معلوم ہوتے ہو۔ اس جملے پر ایسا معلوم ہوا جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے لیکن قبل اس کے کہ میں کوئی داؤ آزماتا تم نے دروازے پر تال دینی شروع کر دی"، تھوڑی دیر بعد شفیع نے پوچھا۔ "اب کچھ اپنی بھی تو سناؤ" غضنفر نے ایک گہرا سانس لے کر کہا "میری کیا پوچھتے ہو۔

"میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا"

شفیع نے دل میں کہا۔ واہ، بجر بٹو، اچھا ہی ہوا جو تم تر نہ ہوئے۔ مطمئن جنگ اور شفیع کے قصے سن کر غضنفر کے دل میں اتنی وسعت پیدا ہو گئی تھی کہ اس میں ایک نہیں سیکڑوں جیکب سما سکتے تھے۔ رقابت کی بھلا کیا گنجائش ہے۔ ہم سب ایک ہی ستم ظریف کے شکار ہیں۔ ایک ہی ہرجائی کے دیوانے۔ ایک ہی عیار ہاتھ کے اشارے پر کٹھ پتلیوں کی طرح ہمیں نچائے جا رہے ہیں۔ کٹھ پتلیوں کی طرح ناچنا ہی ہمارا مقدر ہے۔ یوں کہا زرتشت نے اور بڑی شیطانی سے آنکھ ماری۔

مطمئن جنگ نے کھنکار کے نشست بدلی۔ غضنفر اپنے چہرے پر ایک درباری مسکراہٹ لیے ہوئے ان کے پاس گیا۔ اپنے انداز سے وہ یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھ چکا ہے "نواب صاحب۔ یہ کم بخت تو بڑی آفت کی پرکالہ نکلی۔ "نواب صاحب غضنفر کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس نے کرید کرید کے شفیع سے سب کچھ معلوم کر لیا ہو گا اور اس وقت تو قدرت نے دونوں کو ایک ہی حمام میں جمع کر دیا تھا۔ اب کیا کسی بات کا پردہ، وہ مسکرا کے بولے۔ "میری پیٹھ پر تو پیار کرتے کرتے اس نے ایک دفعہ کاٹ بھی لیا" "کاٹ لیا۔" غضنفر نے اپنی آواز میں ہمدردی کی لچک پیدا کرتے ہوئے کہا۔ نواب صاحب نے کہا "سمجھ میں نہیں آتا کہ مرد عورت کی ضد کے آگے اس قدر مجبور کیوں ہو جاتا ہے؟ مجھے حیرت ہے کہ میں کس طرح قمیض اور بنیان اتارنے پر راضی ہو گیا۔" غضنفر نے ایک ٹھنڈا سانس لے کے کہا "نواب صاحب۔ یہ عورت ذات ہوتی ہی بڑی قیامت ہے۔" حمام کی فضا نے مطمئن جنگ کو اتنا نرم کر دیا کہ وہ اپنی فطری احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر بولے "جب کپڑے اتارنے کے بعد میری نظر آئینے پر پڑی تو ننگے بدن پر دستار ایسی بے تکی معلوم ہوئی کہ میرا جذبۂ وفاداری متزلزل ہو گیا۔ دستار اور بکلوس لگا کے ہم لوگ زندگی کی کتنی نیچی سطح پر اتر آتے ہیں" غضنفر کا دل چاہا کہ مطمئن جنگ کے ایک چپت لگا کے کہے کہ چیر اپ اس میں غم کرنے کی کیا بات ہے۔

دستار سے سر چھوٹا ہوتا ہے اور بکلوس سے پیٹ بڑھتا ہے اور صحت کے لیے یہ دونوں چیزیں بہت مفید ہیں۔ فرخندہ نگر کی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے مطمئن جنگ اپنے خیال میں امرائے پائگاہ تک پہنچے تھے اور یہاں بھی انھیں وہی بے بسی نظر آئی تھی۔ نواب سر آسمان جاہ بشیر الدولہ کو مخاطب کر کے انھوں نے حقارت سے کہا تھا۔ "تم آسمان کے جاہ ہوا ے دولا بشیر الد بس تم کو بھی دیکھا، "فرخندہ نگر

کے ریاستی نظام سے مایوس ہو کر اور اپنی قسمت پر صبر کر کے مطمئن جنگ نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چاندی کی ڈبیا نکالی اور ڈبیا میں سے کاجو اور پستے کھا کے اپنا غم غلط کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد انھیں غضنفر کا خیال آیا اور انھوں نے ڈبیا اس کی طرف بڑھائی۔ کاجو اور پستوں کی نمکینی سے غضنفر کی طبیعت ترنگ میں آئی اور اس نے یہ سوچنا شروع کیا کہ جل سے انتقام کیوں نہ لیا جائے۔ پہلے تو ادھر اُدھر کے بے تکے مذاق اس کے خیال میں آئے لیکن رفتہ رفتہ یہ شوخی سنجیدگی میں تبدیل ہو گئی اور اسے شدت سے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ اس کے ساتھ بڑی زیادتی کی گئی ہے۔ شفیع اور مطمئن جنگ ریاستی کارخانے کے بے حقیقت کل پرزے ہیں لیکن وہ ایک ادیب ہے، فنکار ہے اس کے خلاف ایسی جسارت کرنا زندگی اور ادب کی توہین ہے۔ اسے کسی نہ کسی طرح جل کی اس گستاخی کا جواب دینا چاہیے۔ وہ اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ اس کے دور رس ذہن نے قانونِ تعزیرات کی قندیل چمکائی۔ واہ کیا مارا ہے جل کو۔ اس پر تو بیک وقت سیکڑوں دفعات لگ رہی تھیں۔ فریب دہی، ذہنی اور جسمانی ایذا رسانی اور اس پر طرہ غسل خانے میں حبس بے جا اور بھلے آدمیوں کی یہ توہین، ازالہ حیثیت عرفی، واہ غضنفر کہاں کی کوڑی لائے ہو پیارے۔ غضنفر کی آنکھیں انتقام کی خوشی سے چمکنے لگیں۔ اپنے خیالات کو ایک لڑی میں پرو کے اس نے مطمئن جنگ کو متوجہ کیا۔ ''نواب صاحب آپ نے یہ بھی سوچا کہ ہم جل کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کر سکتے ہیں۔'' نواب صاحب نے ذرا حیرت سے غضنفر کی طرف دیکھا۔ ''یوں دفعیں تو اس پر بہت سی لگتی ہیں لیکن سب سے زیادہ سنگین دعویٰ ازالہ حیثیت عرفی کا ہو سکتا ہے۔'' نواب صاحب سراپا استعجاب بن کر غضنفر کو تکنے لگے۔ غضنفر نے یہ سوچا کہ مطمئن جنگ کو ان کی اہمیت کا احساس دلائے بغیر قائل کرنا ذرا مشکل ہے۔ ''نواب صاحب ہم چھوٹے لوگ ہیں۔ ہماری عزتیں بھی چھوٹی ہوتی ہیں۔ لیکن اگر آپ کی طرف سے ہتک عزت کا دعویٰ ہو گیا تو جل کو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔'' نواب مطمئن جنگ کچھ دیر تو سنتے رہے پھر ان کے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم آیا اور انھوں نے سوچا کہ لاؤ آج ذرا اس لونڈے کی کچھ خبر ہی لے لی جائے۔ روز روز ایسے موقع کہاں ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے چہرے کو ایک سوالیہ نشان بناتے ہوئے پوچھا۔ ''غضنفر تم اپنے آپ کو ادیب کہتے ہو نا؟ سوال ایسا بے ڈھب تھا کہ غضنفر سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ لجاجت سے مسکرایا اور کسمسا کے رہ گیا۔ مطمئن جنگ نے اپنی پڑی ہوئی آواز اور بے امان لہجے میں سوال دوہرایا ''تم اپنے آپ کو ادیب کہتے ہو نا، مجھے حیرت ہے کہ تم اپنے آپ کو ادیب سمجھتے ہوئے بھی مزاح کی حس سے اس قدر کورے ہو'' غضنفر سٹپٹا گیا اس کے لیے مطمئن جنگ کا یہ لہجہ بالکل نیا تھا اس نے گھبرا کے کچھ کہنا چاہا لیکن مطمئن جنگ اسے مہلت دیے بغیر بولے، ''تم خود تو ہر ایک پر چھینٹے اُڑاتے رہو، لیکن اگر تم سے کبھی کوئی مذاق کرے تو عدالتی دھمکیوں اور گھٹیا ہتھکنڈوں پر اتر آؤ۔ یہ کہاں کی انسانیت ہے۔'' غضنفر نے یہ دیکھا۔ کہ اب تو ادب سے گزر کر اس کی انسانیت بھی خطرے میں پڑ گئی ہے تو ایک مظلومیت کے ساتھ اس نے احتجاج کیا۔ ''نواب صاحب میرا مطلب یہ تھا کہ لیکن نواب صاحب نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''کیا عدالتوں کے پاس اور کوئی کام نہیں ہے کہ وہ ایسے مقدموں کی سماعت کرتی پھریں اور پھر کہیں ایسے معاملے بھی مقدموں سے طے ہوئے ہیں۔ صاحبزادے سب سے بڑی عدالت زندگی ہے۔ اگر تم زندگی میں اپنی عزت کی حفاظت نہیں کر سکتے تو دس عدالتوں کے فیصلوں سے بھی کچھ نہ ہو گا۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ مالی فائدہ ہو جائے'' مطمئن جنگ نے

محسوس کیا کہ ان کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا ہے تو وہ پھر ادب کی طرف پلٹے، ''ایک ادیب کی حیثیت سے تمھارے دل میں اتنی گنجائش ہونی چاہیے کہ اگر تم پر کوئی ہنسے تو خود تم بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو جاؤ۔ اگر ادیب کے دل میں اتنی بھی وسعت نہ ہو تو اس کے ادب میں سچائی کہاں سے آسکتی ہے'' یہ کہہ کر مطمئن جنگ بڑی شفقت سے مسکرائے اور کاجو اور پستوں کی ڈبیا غضنفر کی طرف بڑھا کر بولے، ''کچھ پستے اور کاجو لو، خاصے مزے کے ہیں۔''

قہر درویش بر جانِ درویش

غضنفر بے چارے کو مجبوراً ایک کاجو اُٹھانا پڑا۔ پھر اس نے یہ سوچا کہ یہی کیا کم ہے کہ نواب صاحب اس کے زخموں پر کاجو اور پستوں کا مرہم رکھ رہے ہیں۔ ایک شکست خوردہ حریف کی طرح اس نے کاجو کا جواب مسکراہٹ سے دیا اور مطمئن جنگ کی کھڑکی سے رخصت ہو کر غسل خانے کے دوسرے کونے میں ایک دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ قریب ہی بالٹی پر بیٹھا ہوا شفیع کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ مطمئن جنگ نے غضنفر کی دکھتی ہوئی رگ پکڑلی تھی۔ وہ ان کی باتوں پر خفا ہونے کے بجائے ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ آج پہلی دفعہ اسے اپنے اوپر شک ہو رہا تھا۔ کیا واقعی اس کے سینے میں ایک فنکار کا دل ہے، کیا واقعی وہ ادیب ہے، اگر ہے تو اس کے دل میں وسعت کیوں نہیں ہے۔ اس کی فطرت میں خلوص کیوں نہیں ہے۔ کیا اس کا ادب صرف بازی گری ہے۔ کھیل تماشے سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ زندگی کی سطح پر لہروں کا ایک بے معنی سا جال۔ نہیں وہ ادیب تو ضرور ہے لیکن ممکن ہے کہ ادیب ہونے کے علاوہ کچھ اور بھی ہو۔ ہاں وہ ادیب ہونے کے علاوہ اور بھی کچھ ہے۔ وہ ایک انسان ہے اور انسان صرف ادیب ہی تو نہیں ہوتا۔ لیکن یہ انسان ایک بہت مبہم سا تصور ہے اسے واضح طور پر جاننا چاہیے کہ وہ اور کیا کیا ہے؟ اپنا تجزیہ کیے بغیر وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ وہ اسی فکر میں غلطاں تھا کہ اسے مطمئن جنگ کے پیچھے دبیز شیشوں میں زرتشت کا چہرہ نظر آیا ''تم ہو ایک درباری'' یوں کہا زرتشت نے اور اپنی بات ادھوری چھوڑ کر شیشوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔

زرتشت میرے بھائی، میرا پیچھا چھوڑو، میں باز آیا تمھاری ہرزہ سرائی سے۔ مجھے اپنی فطرت اور اپنے ادب کا جائزہ لینے دو۔ ''ادب'' زرتشت کا چہرہ پھر نمودار ہوا ''ادب پیدا کرنے میں جگر خون ہو جاتا ہے۔ ادیب کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں۔ پیشانی پر موت کا پسینہ آجاتا ہے۔ کیا تم تخلیق کی لگن میں اس موت سے گزرے ہو۔''

غضنفر کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا ''موت سے ہراساں مت ہو۔ ادب کی راہ میں مرنے والوں کے لیے:

ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

غضنفر کا سر چکرا رہا تھا۔ لیکن اگر جانِ دیگر سے پہلے مرنا ضروری ہے تو ادب کو میرا اسلام۔ ''تو پھر درباری جاؤ۔ مایا کی پوجا کرو۔ مایا میں تمھاری مکتی ہے۔''

زرتشت کا چہرہ شیشوں کے پیچھے ڈوب گیا۔ غضنفر نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ہاں مایا میں میری مکتی ہے۔ مہارانی مہامایا کے بطن سے گوتم پیدا ہوا لیکن اس نے اپنی ماں اور مایا دونوں سے ناطہ توڑ لیا۔ کتنی بڑی قیمت پر اس نے زندگی خریدی۔ میں مایا کی چھایا

ہی میں زندگی حاصل کرلوں گا چاہے وہ ایک لمحہ ہی کی کیوں نہ ہو۔ غضنفر نے رومال سے پسینہ پونچھا۔اس کے پاؤں پھر زمین پر جم رہے تھے۔ مایا میں بڑی کشش ہے۔ تم مایا کے، پجاری ہو لیکن اس پوجا کے لیے اپنے آپ کو سمجھنے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ بتاؤ تم کیا ہو! ادب کا قصہ ختم ہوا اس سوانگ پر ایک۔ بے لاگ اعتراف کا آخری پردہ ڈال دو۔

"منکہ ایک درباری" کہو کیسی سرخی رہے گی۔ اس کی موقع پرست فطرت نے پوچھا "منکہ ایک کٹھ پتلی" اس کی کم ہمتی نے ہمت کی نہیں۔ "منکہ ایک جاسوس" اس کے تجسس نے اسے اکسایا۔ اس کے دل نے پھر زندگی کی حرارت محسوس کی۔ اسے جل کے الفاظ یاد آنے لگے۔ "اور تم بھی تو ایک جاسوس ہی ہو، جو میرے بھید لینے کے لیے" تو پھر فیصلہ ہو گیا۔ منکہ ایک جاسوس۔ لیکن جاسوس بہت کمزور لفظ ہے۔ "منکہ ایک سراغ رساں ایجنسی" اس کی خود اعتمادی نے قطعی فیصلہ کر دیا۔

غضنفر اپنی فطرت کے تجزیے میں محو تھا اور برابر ہی شفیع بالٹی پر بیٹھا غالب کے مصرعوں سے الجھ رہا تھا۔ اسے یہی شوق تھا کہ مشہور شعروں کو توڑ مروڑ کر خانزادے، کے کام کا بنائے جب کسی بڑے شاعر کے شعر پر جنسی مذاق کا ترپ پڑتا تو بڑے خانزادے مزے لے لے کر بے حال ہو جاتے۔ واہ کیا سالے کی دم میں نمدا باندھا ہے۔ شفیع خانزادے کے میلان طبع کے مطابق خوب مصاحبت کا حق ادا کرتا۔ اس وقت تو وہ یوں بھی جل سے خار کھائے بیٹھا تھا "یہ نہ تھی ہماری قسمت والی غزل کا یاد آنا جو سب کے حسب حال تھی غضب ہو گیا۔ اس نے اوپر سے نیچے تک ساری غزل کو سونت دیا:

"ترے جسم سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا"

سامنے ہی شکار اور فگار کے قافیے نظر آ رہے تھے لہو کی رعایت فگار اور خانزادے کی مناسبت سے شکار۔ لیکن قبل اس کے کہ شفیع کوئی فیصلہ کر سکے غسل خانے کا دروازہ ایک چھپاکے کے ساتھ کھلا اور کمانڈرِ افواج خان شاہی، والا شان ہز ہائی نس خانزادے کے خود بہ نفس نفیس اندر دھکیل دیا گیا۔

خانزادے پر عجیب بدحواسی طاری تھی۔ چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ غسل خانے میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر مطمئن جنگ پر پڑی اور پھر غضنفر اور شفیع پر۔ مطمئن جنگ ایک دم کھڑکی سے کودے اور نظریں جھکا کے دست بستہ کھڑے ہو گئے غضنفر اور شفیع سناٹے میں آ گئے کہ اب کیا ہو گا۔ غضنفر نے شفیع کی آڑ لیتے ہوئے سوچا لو مایا کی چھایا بھی گئی۔ خانزادے نے آنکھیں مل مل کے ان تینوں کو دیکھا اور جب ان کی غداری کا انھیں تھوڑا بہت اندازہ ہوا تو دانت پیس کر بولے۔ "پاجیو ٹھہر جاؤ۔ فرخندہ نگر پہنچتے ہی اگر تمھاری کھال میں بھس نہ بھر وادوں تو۔" خانزادے کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی مطمئن جنگ ایک قدم آگے بڑھے اور دستار کو خم کر کے بہت ادب سے بولے۔ "پیر و مرشد کو شاید کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے،" "غلط فہمی!" خانزادے ایک دم کھول گئے اور غلط فہمی کو ایک موٹی سی گالی دے کر بولے "نواب" تم سے مجھے کوئی شکایت نہیں۔ لیکن یہ دونوں بدمعاش یہاں کیا کر رہے تھے۔" "مطمئن جنگ نے کہا،" قبلہ پیر و مرشد، ہم تینوں کو یہاں اس لیے بلایا گیا تھا کہ اگر سرکار کی خلوت میں کوئی مخل ہو اور سرکار کو یہاں پناہ لینی پڑے تو ہم حضور کی وقت گزاری کے لیے موجود ہوں۔" "سچ کہتے ہو نواب؟" "جی

ہاں قبلہ پیرومرشد۔" مطمئن جنگ کی حاضر دماغی سے غضنفر اور شفیع کی جان میں جان آئی۔ خانزادے کا غصہ کافور ہو گیا اور انھوں نے کچھ محظوظ ہو کر کہا۔ "عجیب عورت ہے۔ ایک طرف ایسے نخرے اور دوسرے طرف ایسا خیال۔" شفیع نے خانزادے کی خوشنودی حاصل کرنے لیے قریب آ کر کہا۔ "حضور اس کے نخروں میں گرم مصالحہ"، خانزادے کھلکھلا کر ہنسے، "ہاں گرم مسالہ بالکل گرم مسالہ"، غضنفر نے سوچا کہ جب مایا کی پوجا ہی کرنی ہے تو وہ مصاحبت میں شفیع سے کیوں پیچھے رہے۔ اس نے بھی ذرا بڑھ کر کہا، "حضور ایک سیر دو سیر نہیں پورا ڈھائی من گرم مصالحہ۔" خانزادے پھر ہنسے اور غضنفر کی طرف اشارہ کر کے مطمئن جنگ سے بولے، "نواب اب یہ بھی کچھ چل نکلا ہے۔" شفیع نے اس کا سہرا اپنے سر لیتے ہوئے کہا، "سرکار یہ بندے کی صحبت کا اثر ہے" خانزادے نے مصاجت کی اس فضا سے خوش ہو کر ایک سگار سلگایا اور آہستہ آہستہ غسل خانے میں ٹہلنے لگے۔ "یہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ شفیع نے بڑی مستعدی سے جواب دیا۔ "اگر حضور مناسب سمجھیں تو ٹب میں غسل کے لیے پانی تیار کر دوں۔" غضنفر نے بھی اس خیال کی تائید کی "یور ہائی نس ٹب میں آرام سے لیٹ سکیں گے۔" خانزادے غسل کی ضرورت کے خیال سے خوش ہو کے راضی ہو گئے۔ شفیع نے گرم اور ٹھنڈے پانی کے نلوں کو ایک ساتھ کھول دیا۔ تھوڑی سی دیر میں ٹب بھر گیا۔ شفیع اور غضنفر دونوں نے مل کر خانزادے کے کپڑے اتارے۔ ایک تولیہ بندھوا کر خانزادے پانی میں اترے اور مزے سے ٹب میں دراز ہو گئے ٹب میں لیٹ کے جب نیم گرم پانی سے ان کے مسام کھلے تو ان کی سخاوت کا دریا جوش میں آیا اور انھوں نے اپنا سگار منہ سے نکال کر غضنفر کو دیا "لو غضنفر اسے پی کے دیکھو کیا مزے کا سگار ہے۔" غضنفر نے سگار لیا تو پون انچ تک خانزادے کے لعاب میں سنا ہوا تھا۔ یا خدا میں کس طرح اس سگار کو پیوں گا۔ غضنفر کے دل نے فریاد کیا۔ شفیع نے آنکھ مار کے کہا۔ "ذرا پی کے تو دیکھو غضنفر۔ سرکار کے لعاب سے تمباکو کی خوشبو کیسی نکھر آتی ہے۔" خانزادے خوش ہو کر بولے "ہمارے پیے ہوئے سگاروں سے تو خان حضرت کا آب خاصہ بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔" غضنفر نے ایک فرشی سلام کر کے کہا۔ "ذرہ نوازی ہے سرکار کی" اور پھر دل کڑا کر کے خانزادے کے لعاب کی پون انچ ٹھنڈک کو اپنے ہونٹوں میں لیا اور ایک بہت ہی اوپری قسم کا کش لے کر کہا، "سبحان اللہ کیا مہک ہے اس سگار کی۔" خانزادے نے سر ہلا کر تبسم فرمایا۔ غضنفر نے ان کی نظر بچا کے جلدی سے ہونٹوں کو آستین سے پونچھا۔ کاش وہ بیسن کے قریب جا کر اس غلاظت کو تھوک سکتا۔ "پیتے رہو۔ پیتے رہو۔" خانزادے اور آرام سے لیٹتے ہوئے بولے۔ غضنفر کو اپنی قسمت پر صبر کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ اپنی کراہت کم کرنے کے خیال سے یہ سوچنے لگا۔ چلو اس طرح بالواسطہ میرے ہونٹ تو خانزادی کے ہونٹوں تک پہنچ گئے لیکن فوراً ہی اسے خیال آیا کہ خانزادی کیا اس وقت تو اس کے ہونٹ فرخندہ نگر کی ساری سیاہ نسل کے ہونٹوں پر ہیں۔ اس نے ایک کش لے کر دھواں چھوڑا تو مطمئن جنگ نے مسکرا کے بہت آہستہ سے کہا:

"کوہکن دود کش خلوتِ حمام رقیب"

ایک خنجر سا غضنفر کے جگر کے آر پار ہو گیا۔ دربار کی زندگی اس کے سوا اور کیا تھی۔ تعیش کے باسی پلاؤ کے سوکھے لقمے اور تر۔نگار۔ میں باز آیا ایسے تعیش سے۔ اس سے تو شعبہ مطبوعات کی نائب مددگاری کہیں بہتر ہے۔

شفیع ٹب کے کنارے بیٹھا ہوا خانزادے کے بال دار سینے پر صابن مل رہا تھا۔ مطمئن جنگ ذرا دور ہٹ کے مؤدب کھڑے تھے اور غضنفر دیوار سے لگا ہوا سگار پی رہا تھا۔ شفیع نے جھک کر پوچھا۔ "سرکار کا وقت کیسا گزرا۔" "تم سے کیا پردہ شفیع، وقت تو اچھا گزرا لیکن کسر رہ گئی۔ عین وقت پر کسی نے دستک دے کر سارا کھیل بگاڑ دیا۔" "اگر حضور اجازت دیں تو اس موقع پر کا ایک شعر سناؤں" "ضرور، ضرور" خانزادے نے اشتیاق سے کہا، شفیع نے اپنا ہاتھ روکتے ہوئے کہا "یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا" دوسرے مصرعے کے پہلے حصے کو ادا کرتے ہوئے شفیع نے اپنی آواز کو گرا کے اٹھایا تو غضنفر صرف اتنا سن سکا، کبھی وہ سوار ہوتا۔ خانزادے نے بے اختیار ہو کر اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں پر مارا تو اس زور سے پانی اُڑا کہ چھینٹے مطمئن جنگ کے چہرے تک پہنچے۔ خانزادے خوشی کے مارے تولیہ سنبھالتے ہوئے ٹب سے نکل آئے۔ "واللہ کیا بات ہے۔ کیا بات کہی ہے۔ کبھی ہم سوار ہوتے۔ کبھی وہ سنا آپ نے نواب، کمال کر دیا شفیع نے۔" "مطمئن جنگ نے اپنی دستار ہلا کر داد دی۔ "کیا بات ہے سرکار"۔ غضنفر نے سگار اپنے منہ سے نکالتے ہوئے کہا، "شفیع کمال کر دیا تو نے۔ کیا غضب کا مصرعہ لگایا ہے۔ اگر سرکار اجازت دیں تو اس مصرعے کے انعام میں یہ سگار تمھیں دے دوں۔" خانزادے نے کہا "ہاں ضرور۔ ضرور۔" شفیع نے بڑی تیکھی نظروں سے غضنفر کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ اچھا بچو اب ہم پر بھی چوٹ کرنے لگے، "غضب کا مصرع"۔ خانزادے پھر بولے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنا جملہ ختم کر سکیں۔ غسل خانے کا دروازہ ایک مرتبہ پھر کھلا اور جل اور جیکب کے مسکراتے ہوئے چہرے اندر جھانکنے لگے۔ خانزادے کے جسم پر بندھا ہوا چھوٹا سا تولیہ اور سینے کے بالوں پر صابن کے جھاگ دیکھ کر جل کو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ اس کے ستم ظریف قہقہے کھنکتے ہوئے، بر بجی قہقہے غسل خانے کی دیواروں سے ٹکرا کر ہر طرف بکھرنے لگے۔ جیکب خوش ہو کر کبھی مطمئن جنگ کو دیکھتا اور کبھی غضنفر کو۔ غضنفر کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جا رہا ہو۔ جب جل نے اپنے قہقہوں میں سارے غسل خانے کو غرق کر دیا تو جیکب نے اسے کھینچتے ہوئے چلنے کا اشارہ کیا۔ جل نے ہاتھ ہلا کر چیریو کہا اور زور سے دروازہ بند کر کے ایک جل پری کی طرح غائب ہو گئی۔

فرخندہ نگر کے یہ چاروں سورما حیران تھے کہ یہ ہوا کیا۔ اتنے میں جل کے ملازم نے دروازہ کھول کر اطلاع دی کہ خان پیلس کی چاروں موٹریں سڑک کے کنارے کھڑی کر دی گئی ہیں۔

"چھ... ال کہیں کی۔" خانزادے نے دانت پیس کر کہا اور تولیہ لپیٹے ہوئے غسل خانے سے نکل آئے۔ غضنفر نے کندھے پر خانزادے کے کپڑے ڈالے اور سر جھکائے ہوئے ان کے پیچھے ہو لیا۔ شفیع ایک رومانوی شام کے اس ڈرامائی اختتام سے بہت خوش تھا، اور مطمئن جنگ اپنی خمیدہ کمر میں ایک میٹھا سا درد محسوس کرتے ہوئے یہ سوچ رہے تھے:

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

(بہ شکریہ: اک مختصر خیال)

آمنہ آپا... افتخار عدنی

جمیل الدین عالی

آمنہ آپا

بیگم آمنہ مجید ملک نے وفات پائی۔ عمر ۹۱ سال۔ وہ ایک صد جہت خادمۂ خلق تھیں اور رشتے دار تو دو چار مگر ماتم گسار لاکھوں چھوڑ گئی ہیں۔ میں خود بیمار تھا اور ڈاکٹر کی خدمت میں حاضر۔ دفن میں نہ جاسکا۔ سچ کہ اتنی مشقت کی ہمت اور طاقت بھی نہیں رہ گئی ہے۔ بس بعض اموات پر میرا قلم شریک رسوم ہو جاتا ہے۔

آمنہ ملک کو میری نسل نے آمنہ آپا ہی دیکھا اور کہا۔ زیادہ قریب کے لوگ "باجی" بھی کہہ دیتے تھے۔ مگر وہ ساری عمر ایک ہی روپ میں نظر آتی رہیں۔ وہ روپ جس میں انھیں خود ایک نہایت ہی خوبصورت، وجیہہ اور پر شکوہ نوجوان پنجابی نے دیکھا تھا یعنی "حسینہ نازنین"... یاد کیجیے ان کے لیے کرنل مجید ملک کی لافانی نظم جو اردو کلاسیک میں داخل ہو چکی ہے۔ مگر اے حسینہ نازنیں مجھے تجھ سے عشق نہیں، نہیں"

علم و فضل کے لحاظ سے ایک بہت بڑے باپ پروفیسر ڈاکٹر بٹ لاہوری معنوی طور پر ڈاکٹر بٹ علیگ کی حیرت انگیز طور پر ہونہار صاحبزادی آمنہ آپا نے میٹرک، انٹر اور بی اے (لاہور سے) بی اے اور بی ٹی علی گڑھ سے اور ایم اے فلسفہ (بمبئی یونی ورسٹی سے) درجہ اول میں کیے۔ انگریزی کی صحافی، غیر منقسم ہندوستان کی پہلی خاتون تھیں جنھیں رائٹرز جیسی عالمی خبر رساں ایجنسی نے ہندوستان میں اپنا نمائندہ اور وہاں دوسرے نمائندوں کا نگراں مقرر کیا۔

چوں کہ ان کے فاضل والد ڈاکٹر شریف صاحب نے علی گڑھ ہی کو اپنا گھر بنالیا تھا اس لیے غیر لاہوریوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی جو پاکستان آئی آمنہ آپا کے ان پر علی گڑھ میں چند در چند احسانات اور خوبصورت صحبتوں کے حوالے سے انھیں اپنا سمجھتی تھیں۔ میری بیوی اور میرے بیشتر سسرالی خواتین جس طرح ان کے سامنے سر احترام جھکاتی تھیں اور جس طرح وہ ان سب کے ساتھ اپنائیت اور شفقت کے ساتھ پیش آتی تھیں وہ مناظر مجھے اپنا دہلی کا لڑکپن یاد دلا دیتے تھے۔ آمنہ آپا کی زبان بھی مجھے تو خالص دلی کی لگتی تھی اس میں لاہور تو کیا علی گڑھ کی کوئی نشانی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ میں اپنے اور گلڈ شروع ہونے کے بعد ان کی خدمت میں کم کم حاضر ہوتا تھا زیادہ اس وقت جب فیض صاحب لاہور سے آکر وہاں قیام کرتے تھے یا کبھی کبھی اللہ بخشے کرنل صاحب بلا لیتے

تھے لیکن میری بیوی ان کی باقاعدہ مصاحبت میں رہیں۔ اور بعد میں ایک چھوٹی بہن بیگم طاہرہ رشید نے ان کے کالج میں کچھ عرصہ ملازمت بھی کی۔ یوں مجھے ان کی خدمت خلق کے پچاسیوں واقعات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ ۱۹۵۵ء میں جب انھوں نے پی ای سی ایچ گرلز اسکول قائم کیا (پھر کالج کا اضافہ بھی ہوا) میں ان کے مع (خواہ معمولی کارکنوں میں شامل رہا۔ ان کی بے غرضی اور محنت دونوں مجھے آج بھی مثالی لگتی ہیں۔ ادب کی خدمت انھوں نے کم نہیں کی۔ جب فیض صاحب، جناب مشفق خواجہ اور ان کے ایک قریبی ساتھی (مجھے ان کا نام یاد نہیں آرہا عرفیت مرزا صاحب سابق وطن حیدر آباد، دکن) نے غالب لائبریری قائم کی تو اس کی بے سروسامانی کم سے کم کرنے میں آمنہ آپا نے جان لڑا دی تھی۔ آج وہ کتب خانہ جگہ کی محدودات کے باوجود کراچی میں ہی نہیں پاکستان بھر کے کتب خانوں میں نہایت ممتاز اور فنی لحاظ سے منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اپنی طویل بیماری کے زمانے میں بھی وہ میری اطلاع کے مطابق اس کے عملی (اعزازی) منتظم اور نگراں جناب مشفق خواجہ سے مسلسل رابطے کے ساتھ دامے درمے قدمے کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھیں۔ فیض صاحب کا سر جھکا کر گھنٹوں نہیں تو پہروں ان کی ڈانٹیں سننے کا اعزاز ان گنہ گار آنکھوں نے بھی چند بار دیکھا ہے۔ لاہور اور سیالکوٹ کا مجھے علم نہیں کراچی میں آمنہ آپا واحد فرد تھیں جو (عموماً ایلس فیض کی شکایت پر) ہم جیسے چڑ قنات جونیئرز کے سامنے بھی بلا تکلف فیض صاحب کی خبر لے سکتی تھیں۔ وجہ شکایت عموماً فیض صاحب کی ان کی صحت سے نامتناسب شب بیداری کے ساتھ کبھی کبھی نقصان دہ حد تک بڑھ جانے والی خوش خوراکی ہوتی اور چند بار کسی اچھی کمائی اور گھر میں شدید ضرورت کے باوجود ایسی فیاضی کہ جیب بالکل خالی ہو جاتی تھی۔ (یہ فیض صاحب کی زندگی کا وہ پہلو ہے جو میں نے ان کے سوانح نگاروں کی تحریروں میں کم دیکھا ہے۔ زیادہ تر واقعات ان کے ادوار کراچی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ جب وہ ہارون انٹر کالج کے پرنسپل تھے انھیں اس وقت کے مطابق ایک اچھی رقم ملی۔ شاید لندن سے کسی سلسلے سے کوئی رائلٹی آئی تھی۔ ڈیڑھ دو ہزار روپے۔ ایک دن پہلے کسی یتیم طالب علم نے اپنی بیمار ماں کا دکھڑا سنایا تھا انھوں نے (شاید نرسری والے گھر میں رہتے تھے) مجھے میرے گھر سے بلایا (میں محمود حسین روڈ پر رہتا تھا) ذرا ایک گھر تلاش کرنا ہے... وہ گھر کوئی گھنٹہ بھر میں ملا۔ مجھے پیٹرول دوسری مرتبہ بھروانا پڑا۔ اس کے گھر پہنچے تو وہ غائب تھا۔ ماں بستر سے نہیں اٹھ سکتی تھیں۔ مجھے ایک ہمسائی بچی کے ساتھ اندر بھیج کر وہ رقم ماں کو دینے کا حکم دیا۔ ماں صاحبہ ڈیڑھ ہزار روپے دیکھ کر اتنی گھبرائیں کہ ہاتھ جوڑ کر رقم واپس کر دی۔ میرا بچہ مزدوری پر گیا ہے۔ گئی رات کو آئے گا۔ میں اکیلی ہوں۔ سو نہ جاؤں۔ یہ لڑکی باہر جا کر سب کو بتادے گی۔ تو یہاں طرح طرح کے ہمسائے رہتے ہیں۔ کہیں کوئی زبردستی یا چوری سے لے جائے۔ آپ لڑکے کو کل دے دینا" فیض صاحب نے پچھوایا وہ کہاں کام کرتا ہے۔ وہ ایک ٹیکسٹائل مل تھی۔ خاصی دور۔ حکم دیا ادھر چلو وہاں اس کا نشان بڑی مشکل سے ملا۔ اس کو لفافہ دیتے ہی کار اسٹارٹ کروا دی۔ وہ پیچھے بھاگتا رہ گیا۔ میں نے دیکھا رو رہے ہیں۔ بار بار آنسو پونچھ رہے ہیں۔ پھر میرے سر پر ایک معقول وزن کا دھول مارا۔

"او کم بختو یہ سب کب تک چلے گا"

آمنہ آپا کو نہ جانے کیسے رقم کا اندازہ ڈیڑھ لاکھ ہوا ایلس فیض نے تو ڈیڑھ ہزار دو ہزار ہی کہا تھا اس پیشی میں کرنل صاحب بھی

شریک تھے مگر عموماً ان کے ساتھ فیض صاحب کے شریک ملزم ہی کا سلوک ہوتا تھا۔ عینی گواہ صرف میں۔ آمنہ آپا کو یقین تھا کہ میں جو ''فیض صاحب کا آدمی'' ہوں جھوٹ ہی بولوں گا دوران جرح کہا اچھا اپنی بیوی کی قسم کھاؤ۔ میں نے چچا سائل دہلوی کا مصرع پڑھا۔

قسم کیوں کھاؤں، ناجائز قسم یوں بھی ہے اور یوں بھی

تسپر ایک ذیلی خفیہ قسم کے جائز اور ناجائز ہونے کا چل پڑا۔ مجھے دیکھ کر خوشی ہوئی کہ فیض صاحب اس مکتب فکر سے خوب واقف تھے جو قسم کھانے کو ناجائز سمجھتا تھا (وہ مکتب فکر اب بھی ہوگا میرے وقت کی دلّی میں بھی ایسی باتیں بزرگوں تک محدود ہو گئی تھیں) بہر حال میری گواہی تسلیم کر لی گئی مگر اب دوسری مشق شروع ہو گئی۔ اے وہ خاتون کیا بیمار تھی؟ میں کیا بتاتا، کیا تم سے بات کرتے وقت بستر سے اٹھی تھی؟'' ''جی نہیں'' ''رنگ کیسا لگ رہا تھا'' ''زرد'' بس تو اسے دق ہے۔ وہ علاقہ ہی دق کا ہے'' چلو فیض۔ تم اور ایلس تو گھر جاؤ مجھے اور کرنل صاحب کو یہ عالی میاں اب اس لڑکے کے گھر لے جائیں گے اے یہ ڈیڑھ دو ہزار کوئی رقم ہوتی ہے اس علاج کے لیے؟

سچ کہ میں اس شرکت خدمت پر خود کسی قدر خوش تو ہوا مگر اتنی دور گاڑی لے جانے اور واپس آنے میں کوفت کا احساس بھی بہت رہا۔ آمنہ آپا نے وہاں جاتے ہی ایک طرح پوری گلی کو takeover کر لیا دو ہزار روپے اپنے پاس سے دیئے گلی والی خواتین کو باری باری مختلف خدمتوں پر مامور کیا واپس آکر تین دن کے اندر اندر ان خاتون کو ٹی بی اسپتال میں داخل کرا دیا۔ مگر وہ خاتون نہ بچ سکیں۔ اُن کے صاحبزادے ایک ہونہار طالب علم ثابت ہوئے۔ اب امریکہ میں ڈاکٹر ہیں آس پاس کے ضرورت مند پاکستانیوں سے گریز بلکہ نفور کرتے ہیں۔ ابتدا میں مشاعروں میں جاتا تھا تو مشاعرے میں تو نہیں آتے تھے فون کر کے اپنے گھر کھانے پر ضرور بلاتے تھے مگر اس طرح کہ نہ جاؤں تو زیادہ خوش ہوں گے میں ان کے ان حالات ماضی کا ذکر کسی سے نہیں کرتا تھا۔ جب دو تین سال میں انہیں پتہ چل گیا کہ میں نے ان کے ماضی کا چرچا نہیں کیا (ورنہ پاکستانی حسب روایت وطن ان کی شہرت و حیثیت کا پلیتھا نکال دیتے) تو ایک مرتبہ مجھ سے ملنے آئے اپنی پاکستانی میم صاحب سے ملوایا اور فیض صاحب کی تعریف کی اور...... اور دونوں ہاتھ اٹھا کر آمنہ آپا کے لیے دعا کی۔ مسٹر عالی وہاں علاج اور قیام تو مفت تھا مگر اور خرچے بھی ہوتے ہیں کپڑے ماں کے پاس نہیں تھے بہت ممنون ہوں۔ آپ انہیں میرا سلام ضرور پہنچایئے گا۔

''آپ کچھ خیرات پاکستان بھیجتے ہیں؟ میں نے بے محابہ سوال کر ڈالا۔

''مگر یہاں بھی خیرات کے مواقع کم نہیں اور سر ایسی باتیں پوچھی نہیں جاتیں'' ان کی پاکستانی میم صاحب نے کسی قدر درشتی سے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ کاش میں ان کی جوانی کی ان یادوں پر بھی لکھ سکتا جو میری بیوی اور ان کی عزیزوں میں ہر وقت دہرائی جاتی تھیں ان کے مطابق آمنہ ملک ایک سانولی سلونی بیوٹی کوئن ہوتی تھیں۔ کرنل صاحب بہادر نے تین برس خواستگاری کی تب جا کر وہ ''حسینہ نازنین'' ملی۔ ہاں ان کی تین بہنوں کی جوانی ڈھلتے میں نے خود دیکھی ہے ایک تھیں مسز شاغل۔ وہ دہلی میں ہمارے اینگلو عربک گرامر اسکول کی صدر معلمہ تھیں۔ میری یاد کے مطابق رنگ سرخ سپید اور لمبے لمبے بال۔ اس وقت ہمارے کالج اور اسکول کے

سیکریٹری ایک رشدی صاحب تھے جوان، خوش اندام، خوش کلام۔ ان دونوں میں دوستی ہو گئی تو روایت کے مطابق قائد اعظم کے حکم پر صدر ادارہ نوابزادہ لیاقت علی خان نے دونوں کو رخصت کر دیا اور رشدی صاحب انہیں لے کر بمبئی چلے گئے یہ ملعون رشدی وہیں پیدا ہوا۔ ایک بہن میاں افتخار الدین صاحب سے بیاہی تھیں۔ وہ بھی خوش شکل۔ ایک بہن میجر جنرل شاہد صاحب سے بیاہی گئیں، جنرل صاحب بھی خوب صورت اور وجیہہ شکیل اور بیگم صاحب بھی حسین و جمیل۔ میں نے مسز رشدی کو تو پاکستان میں نہیں دیکھا باقی تینوں بہنوں کو اور انہیں ایک دو مرتبہ بعض خاندانی تقریبات میں ایک ساتھ بھی دیکھا ہے آمنہ آپا ستر پچھتر برس کی عمر میں بھی نسوانیت اور الوہیت کا پیکر لگتی تھیں جن کے آگے ان کے نہایت ہی قیمتی لباس اور زیورات اور آداب مجلس سے بھی آراستہ چھوٹی بہنیں سب کچھ ہو کر ان کا جوڑ نہیں لگتی تھیں۔

جب میں نے امریکہ سے واپس ہو کر ان ڈاکٹر صاحب کا سلام پہنچایا تو وہ فوراً انہیں یاد نہ آئے۔ (سیکڑوں ایسے کیس گزر چکے ہوں گے) ان کی بیمار والدہ کے حوالے دیئے تو پہچان گئیں آنکھوں میں آنسو آگئے اے اس بے چاری نے بڑے دکھ اٹھا رکھے تھے مگر تمہیں معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔ نہ ان ڈاکٹر صاحب پر اعتراض کرو۔ معاف کر دو اور بھول جاؤ۔ اللہ انہیں خوش رکھے اور نیک ہدایت دے ہاں عالی میاں ان کے گھر جاتے وقت فیض صاحب نے کیا کہا تھا تم سے؟

"او کم بختو یہ سب کب تک چلے گا" میں نے بیزاری سے دہرا دیا اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے میں سخت نادم کہ اپنی بے شمار (غیر ضروری) مصروفیات کے سبب ان کی خدمت میں حاضری بہت کم ہو گئی تھی اللہ مجھے معاف کرے۔ مگر ایک دن کسی بڑے ادیب کو آمنہ آپا کی کہانی لکھنی پڑے گی۔

افتخار عدنی

آئی اے خاں جونیئر عرف افتخار عدنی نواب محمد اسماعیل خان آف میرٹھ بھارت میں قائد اعظم کے دست راست اور آل انڈیا مسلم لیگ میں کمیٹی آف ایکشن کے صدر، بیرسٹری کے بعد موتی لال نہرو کے گھر رہ کر قانونی پریکٹس کرنے کی تربیت پائی۔ مگر جب برطانوی راج سے نکرلی گئی تو ترک موالات کی مہم میں عدالتوں کے سامنے پیش ہونے سے بھی انکار کر دیا۔ ۱۹۴۵ء میں اس قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے جو آخری متحدہ اسمبلی تھی پاکستان اس لیے ہجرت نہیں کی کہ بھارت میں جو مسلمان رہ گئے تھے ان کے لیے کلیم کرنا تھا اور نہ تینوں بیٹے پاکستان میں سی ایس پی تھے اور ایک مرتبہ جب وہ ملنے ملانے آئے اور خود میرے سامنے ان کے بیٹے عدنی صاحب کے گھر پر (جو میرے ساڑھو تھے) نوابزادہ لیاقت علی خان اور خواجہ ناظم الدین مرحومین نے بہ اصرار انہیں پاکستان آنے اور فی الحال مشرقی پاکستان سنبھالنے کی دعوت، بہ اصرار دی۔ مگر وہ نواب اسمٰعیل خان کی کہانی ہے یہاں عدنی صاحب کا ذکر کرنا ہے جو انیس سو پچاس میں سی ایس پی میں آئے اور اردو فارسی اور مرقع سازی کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ صادقین کو نیپا NIPA کراچی میں محصور رکھ کر پچاسیوں مرقعے بنوالینا خاص طور پر وہ اسمائے حسنہ لکھوالینا جو وہاں آویزاں ہیں انہی کا کارنامہ ہے۔ ان کی انہیں تصنیفات میں اک محشر خیال "افکار پریشاں" غالب شناسی کے کرشمے، اور غالب کے بہت سے فارسی اشعار کے اردو ترجمے

شامل ہیں جب کہ اسی اشاعت میں انہی اشعار کو پروفیسر رالف رسل نے انگریزی میں ترجمہ کر رکھا ہے، حضرت بابا ذہین شاہ تاجی کے بہت سے ترجمے اور اب حضرت بابا تاج الدین اولیاء کے سوانح انگریزی میں آخری مراحلِ تحریر میں تھے۔ بیسیوں مضمون قومی زبان میں چھپتے رہتے تھے ان کا مجموعہ زیرِ ترتیب تھا۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کے اعزازی خازن۔ پاکستان رائٹرز کو آپریٹو سوسائٹی لاہور و کراچی (بانی مسٹر جسٹس ایم آر کیانی مرحوم خاص دور ایوبی میں) میرٹھ لاء ینگ سوسائٹی کے صدر اور کوئی بیس برس سے حضرت ابوالانیس برکت سالار والا (اب مقیم دار الاحسان قریب نہر فیصل آباد کے مرید اور غالباً ایک از متولیان درگاہ (وقف) اور حضرت ذہین شاہ تاجی کے مرید و مترجم بھی۔ دراصل میں سلسلوں کے بیان میں صفر برابر معلومات بھی نہیں رکھتا بس سب سے دعا کا طالب رہتا ہوں۔ عدنی صاحب کی جمال پانی پتی سے مکالمت ریکارڈ کرنے کے قابل تھی کاش ان کی بصارت و قوتِ تحریر انہیں عدنی صاحب پر کچھ لکھنے کی اجازت دے۔ میری بیوی کے سگے ماموں زاد بھائی اور میرے محسن تھے۔ اتفاق کہ میری نزاکت مزاج کے سبب میرے محسنین کی تعداد زیادہ نہیں) احسان نمبر ایک سنیے ۱۹۵۰ء کے سی ایس ایس امتحان میں، میں بھی بیٹھا۔ (دفتر سے تیاری کی چھٹی تک نہیں ملی تھی اور سخت آشفتگی کا زمانہ تھا) انگریزی مقالے میں میرے ۲۵ نمبر آئے اور حسب قاعدہ صفر قرار دیئے گئے فیل ہو گیا۔ عمر جا رہی تھی وزارت تجارت میں اسسٹنٹ تھا، کئی مہاجر اعزا سمیت ایک بڑے خاندان کے بوجھ میں پسا جاتا تھا کلیم Claim وغیرہ کے چکر میں پڑتا نہیں تھا اور اس وقت وہاں ریاست میں بھی اشتلم تھا۔ دفتر اور خزانے لوٹ لیے گئے تھے، والی ریاست حملوں سے جان بچا کر ہمسائے جے پور میں بیٹھ گئے تھے لاہور سے گزرا تو عدنی صاحب وہاں سی ایس پی کی تربیت کے لیے پہنچ چکے تھے۔ مجھ سے کہا آپ ہر طرف ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اچھا کرتے ہیں مگر جب عالم یہ ہو تو سفارش کرانے میں حرج نہیں۔ ''کس کی سفارش کراؤں اور کس سے کراؤں'' ''آپ حضرت داتا صاحب کے پاس جایئے۔ میں نے کہا میں روحانیت کا آدمی نہیں، اللہ معاف کرے ابھی میرا ایمان ذرا کمزور ہے کہا نہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا اور وہ اولیائے پاکستان کے ہماری اصطلاح میں چیف سیکریٹری ہیں۔ کیس میرٹ پر کرتے ہیں۔ آپ محنتی آدمی ہیں میرٹ کا میں خود جج نہیں۔ شاید وہ آپ کو پہچان لیں۔ میں گیا میں نے ان سے دعا کے لیے کہا اگلے سال کہ میں اتنا ہی نااہل تھا کوئی چھٹی لیے بغیر امتحان دیا (وہ ہمیں ملتی ہی نہیں تھی) اور بحمد اللہ کامیاب ہو گیا۔ اسے اتفاق کہنا اچھا نہیں لگتا اور دوسری کوئی توجیہہ مطمئن نہیں کرتی۔ احسان نمبر ۲ جب مجھے ۱۹۶۶ء میں پریس ٹرسٹ سے استعفیٰ دلوایا گیا (کہانی کچھ نور الحسن جعفری مرحوم) کی کتاب میں اوکاڑہ میں کچھ تو مجھے وقتی جائداد عدالت کے حکم کی حد تک تو مل چکی تھی مگر مقدمے سب پر سول مقدمے جو خرچ ہی خرچ کرا رہے تھے۔ میرے پانچ اسکولوں میں اور والدہ اور خوش دامن اور ان کے دو بیٹے میرے گھر میں۔ بینک قرض پر ضمانت میں رہن کے قابل اثاثے مانگتے تھے۔ موٹر رہن رکھوائی دو مہینے کام چلایا۔ اب کس سے مانگوں۔ انکار سے ڈرتا تھا ایک دن عدنی صاحب خود گھر آئے وہ اس وقت اپنے Claim کی بنا پر خاصے صاحب جائداد ہو چکے تھے اور ڈپٹی کمشنر بھی رہ چکے تھے۔ مجھے از خود اس وقت کے ہزار روپے ماہوار قرض کی پیش کش کی (ہاں میں اسے جرمانہ سمجھتا ہوں) کہا جب آپ کو ملیں واپس ادا کر دیجیے گا۔ اتفاق کہ اگلے مہینے مجھے ایک مقدمے میں خاصی زمین مل گئی میں نے بیچ کر ان کا قرض ادا کر دیا مگر آج تک ان کا احسان نہیں بھولا

ہوں۔ احسان نمبر تین۔ یہ احسان جاریہ ہے کیوں کہ لاہور میں نمبر ا منٹگمری روڈ کی گلڈ ہاؤس والی چودہ کنال زمین انہیں عدنی صاحب نے جو اس وقت ڈپٹی اسٹیبلشمنٹ کمشنر تھے، تلاش کر کے گلڈ کو فلاح ادبا کے لیے الاٹ کی تھی۔ میں افتخار عدنی کی روحانیت پر اب بھی کوئی تفصیلی تبصرہ نہیں کر سکتا۔ جیسے میں اسے اشفاق احمد بلکہ اپنے شہاب صاحب تک کی روحانی زندگی پر اب تک کچھ نہیں لکھ سکا ہوں (اللہ اہلیت دے) لیکن اتنا ہر وقت نظر آتا تھا کہ وہ ہر وقت وصل الٰہی کے لیے بے تاب ہیں۔ انتقال اس طرح ہوا کہ میرٹھ سوسائٹی کے میلے کی صدارت کر رہے تھے کچھ لکھنے کو کاغذ اور پیڈ اٹھایا۔ مگر سر پیچھے کر لیا اور پھر نہ اٹھایا۔ افضال منیف اور عائشہ اسلام ساتھ بیٹھے تھے انھوں نے سمجھا بے ہوش ہو گئے ہیں۔ سر اٹھا کر لٹانا چاہا مگر یہاں اپنا کام ختم کر چکے تھے۔

اختصار کے لیے معافی۔ میں تھک گیا اور شرما بھی رہا ہوں کہ میری باری کیوں نہیں آتی۔

(روزنامہ 'جنگ' ۱۷؍ اکتوبر ۲۰۰۴ء)

مطبوعاتِ انجمن ترقی اردو کے لیے لکھے گئے پیش لفظ کا مجموعہ

حرفے چند

از

جمیل الدین عالی

قیمت حصہ اول ۱۰۰ روپے، حصہ دوم ۱۲۵ روپے، حصہ سوم ۱۰۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰

چودھری محمد علی ردولوی کی مزاح نگاری کا جائزہ

ڈاکٹر ثریا شمیل

ادب کا تعلق انسانی زندگی سے ہے اور مزاح انسانی زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اعلیٰ درجے کا مزاح کوئی بے معنی ہنسی یا محض دل لگی نہیں۔ یہ گہرے سماجی شعور، رچے ہوئے ذوق، تہذیب و دانش، زبان پر عبور، اعلیٰ ذہنی تنقیدی صلاحیتوں، تجزیہ اور فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ چودھری محمد علی ردولوی (۱۸ر مئی ۱۸۸۲ء تا ۱۰ر ستمبر ۱۹۵۹ء) نے جو کچھ بھی تحریر کیا اس میں مزاح کی چاشنی ضرور ملتی ہے۔ ان کی ہر تحریر خواہ وہ خط ہو، کوئی مضمون ہو، خاکہ یا انشائیہ ہو، افسانہ یا کہانی ہو، وہ نفسیات، فلسفہ، ادب، معاشرت، لطفِ زبان اور لطیف مزاح کا ایسا مجموعہ نظر آتی ہے کہ قاری مسحور ہوتا چلا جاتا ہے۔

چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط میں مزاح:

وہ خصوصیات جس نے چودھری صاحب کے تحریر کردہ مکاتیب کو ان کے افسانوں، انشائیوں اور خاکوں سے زیادہ دلچسپ بنادیا وہ ان کی شوخی تحریر ہے۔ مثلاً اپنے ۲۲ر ستمبر کے تحریر کردہ خط میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

> شاہ ضیاء الحق کا بی بی سے پندرہ سولہ برس کے بعد ملاپ ہوا ہے۔ اتنے زمانے تک بے چارے بندر کی طرح زندگی بسر کیا کیے۔ کھانا بازار سے کھایا۔ کباب روٹی باورچی کے یہاں سے مول لے لی نہیں تو دکان ہی پر حلوائی سے مٹھائی لے کر کھالی۔ پانی گھر میں آکر پی لیا۔ پان ملا تو ملا، نہیں تو ایک کھٹیا مونہہ میں ڈال اور پیرزادگی کے مزے چوس چوس کر لیا کیے۔ ریوڑی کھٹیا، کچھ مول لینا نہیں۔ مخدوم صاحب کے مزار پر انوار کی طرح ہر وقت برسا کرتی ہیں۔ اب بے چارے پکی پکائی روٹی پاتے ہیں۔ (۱)

یہاں پر چودھری صاحب ضیاء الحق نامی کسی صاحب کا پندرہ سولہ سال تک اپنی بیگم سے کشیدگی کے باعث تجرد کی زندگی گزارنے کا احوال انتہائی مزاحیہ الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ اور ایسی زندگی کو کھانے پینے کے معاملے میں بندر کی زندگی سے مشابہہ

قرار دیتے ہیں۔ بیگم کے گھر واپس آجانے کے بعد ان کی نظر میں گھر کی رونق اس طرح بڑھ گئی ہے جس طرح قصبہ ردولی میں واقع بزرگ مخدوم عبدالحق صاحب کے مزار پر تجلی وانوار کی بارش ہوا کرتی ہے۔ یہ ان کا طنزیہ انداز ہے خاتونِ خانہ کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے۔

چودھری صاحب اپنی دختر نیک اختر ہما بیگم کو ۱۶ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو ذاتی خط تحریر کرتے ہوئے کچھ اس انداز سے رقم طراز ہیں کہ اس میں انھوں نے اپنے آپ کو ہی طنز کا نشانہ بنایا ہے، ”آج کل میں بہت پریشان رہا اور پریشان ہوں مگر میری پریشانی موٹاپے پن کی ہے۔ سکھ روگ لگا ہے۔ بعضے وقت خیال ہوتا ہے کہ کفرانِ نعمت کر رہا ہوں، پھر عقل کہتی ہے:

ہو جائے گا چھوٹی باتوں میں خفا
کیا .تو نے خدا کو آدمی سمجھا ہے

اب مولوی لوگ ان کے کان بھر دیں تو اور بات ہے۔ جیسا کھانا کھاتا تھا ویسے ہی کھانا کھاتا ہوں۔ بلکہ شاید اس سے بہتر اللہ دے دیتا ہو۔ کیوں کہ قیصر آج کل ہمیشہ سے بھی زیادہ خیال کرتی ہے۔ نیا ریشمی لحاف اوڑھتا ہوں، پھر اور کیا چاہیے۔ مگر دل نہیں مانتا۔

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے، مئے گلفام بہت ہے

دکھڑا رونے کو اور کچھ نہ سہی تو یہی ہے کہ سلمان کا خط نہیں آتا۔(۲) سارا خط ان ہی الفاظ پر مشتمل ہے پریشانی اور دکھ کا تذکرہ بھی کس شگفتگی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ انسان کتنا ہی امیر کبیر کیوں نہ ہو اسے کوئی نہ کوئی فکر ضرور لاحق رہتی ہے، اس لیے کہ وہ خواہشات کا پتلا ہوتا ہے۔ اسے فکرِ معیشت نہ سہی مگر تردد زمانہ ضرور ہوتا ہے۔ محبت کی طلب ہوتی ہے، مقاصد کا حصول درکار ہوتا ہے۔ اسی فلسفے کو یہاں چودھری صاحب نے بہت سلیقے سے طنزیہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔

چودھری صاحب بحیثیت تعلقہ دار ایک بہت بڑے زمیندار تھے۔ اور جب زمینداری نظام ختم ہونے لگا تو یہ ان کے لیے بہت ہی بڑا صدمہ تھا۔ جس کا تذکرہ وہ اپنے سے بھی بڑے زمیندار راجہ صاحب سلیم پور کے نام ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں، ”خیر کوئی حرج نہیں۔ اس وقت تک نہ کھانے کی تکلیف ہوئی ہے نہ ضروریاتِ زندگی کی۔ البتہ غرور بری طرح ٹوٹ رہا ہے۔ جس پر باوجود عقل کے نیک مشوروں کے نفس اس وقت تک راضی نہیں ہوا ہے۔ ہزار سمجھاتے ہیں کہ اتنی آراضی، اتنا مال تجھ کو تنہا رکھنے کا کیا حق تھا۔ مگر نفس کسی طرح راضی نہیں ہو رہا ہے۔ نفس کہتا ہے یہ تو درست ہے مگر جن لوگوں کے ہاتھ میں ملک کا انتظام ہے وہ اُلّو کے پٹھے ہیں، ان سے سوائے کام بگڑنے کے بنے گا کیسے۔ ہم دل کو سمجھاتے ہیں کہ گھبراؤ نہیں، دیکھو کیا ہوتا ہے۔ جس قدر رہ گیا ہے اس پر اللہ کا شکر بھیجو۔ تمھارے اعمال تو اس قابل بھی نہ تھے۔ اس جگہ تو ہم بھی قائل ہو جاتے ہیں اور سوائے شکراً شکراً، عفواً عفواً کے کچھ نہیں کہہ سکتے۔“(۳) اتنے بڑے نقصان کا تذکرہ کس طرح اطمینان سے کرتے ہیں۔ لیکن تحریر کی شوخی برقرار رہتی ہے۔ انسان کی ملکیت میں موجود کوئی چیز جب واپس لے لی جائے تو اسے دکھ تو ہوتا ہی ہے۔ وہ رضائے الٰہی کے خیال کے تحت اپنے

دل کو سمجھانے کی غرض سے تاویلیں پیش کرتا ہے۔اسی فلسفے کو چودھری محمد علی نے یہاں پر طنزیہ انداز سے پیش کیا ہے۔ڈپٹی تحصیلدار صاحب کا دیوانِ شاعری پڑھ کر انھیں اپنی رائے سے اس طرح ایک خط میں مطلع کرتے ہیں:

آپ نے اپنا دیوان میرے عزیز بھائی غلام مصطفیٰ صاحب شاعر بے بدل پنشنر تھانے دار کو عنایت کیا۔ موصوف نے تعریف بھی کی مگر دیوان دیکھ کر دل کی کلی کھل گئی۔ انشراحِ قلب ہوا، اس طرح کی فرحت ہوئی جیسے لکھنؤ کے بنارسی باغ میں صبح کی مستی میں کسی شائستہ متوازن، خوش مذاق، شریف مرد سے پہلے پہل ملاقات ہو جائے۔ اور دل فوراً یہ کہے کہ کہیں دیکھا ہے۔ پہلی ملاقات شاید میدان ازل میں ہوئی ہو، جہاں ہم مذاق لوگوں کی ٹولیاں الگ الگ رہی ہوں گی۔ نئی شاعری نے ایسی بلند پروازیاں کی ہیں کہ ان کو سن کر ہم دقیانوسی لوگوں کے حواس اڑ جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں حدود کے اندر والی شاعری اگر کہیں دکھائی دے جاتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بچھڑے مل گئے۔(۴)

یہاں شوخی کے ساتھ متانت اور سنجیدگی بھی موجود ہے۔ ان کی طبیعت میں غضب کا اُبھار تھا جو کبھی انھیں نچلے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ چودھری محمد علی کا یہ انداز ان کی تحریر کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملے سے ٹپکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ظرافت چودھری صاحب کی فطرت ثانی تھی اور انھوں نے جہاں قلم اٹھایا ظرافت کے پھول جھڑنے لگے۔ چودھری صاحب کے ایک دوست ہاشمی صاحب کی ایک اولاد کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ پرسہ ادا کرنے کی غرض سے جب ہاشمی صاحب کو خط لکھتے ہیں تو رسمی علیک سلیک کے بعد کچھ اس انداز سے رقم طراز ہوتے ہیں:

''میں ناتجربہ کاری کے زمانے میں تعزیت اور پُرسے پر ہنسا کرتا تھا۔ میری ایک لڑکی جو بہت دنوں سے بیمار تھی (اس کے علاوہ چار لڑکیاں اور بھی تھیں) وہ گزر گئی۔ صبح کو ایک صاحب تعزیت کو آئے۔ بے چارے کم سخن تھے آکر چپ بیٹھ گئے۔ میں نے کہا ہاں تو پھر شروع کیجیے، بچی کیا بیمار تھی۔ مجھ کو اطلاع بھی نہیں ہوئی۔ خدا آپ کو صبر دے۔ وہ بے چارے پریشان ہو گئے۔ اس کے بعد میرا اکلوتا لڑکا گزر گیا۔ اس واقعے کے بعد ایک دیہاتی جاہل ملاقاتی نے ہمدردی کی۔ عجب بھونڈے طریقے سے اس نے مجھ کو تسکین دی۔ مگر یہ معلوم ہوا کہ جیسے زخم پر کسی نے مرہم رکھ دیا ہو۔ اس نے کہا، ''وہ لڑکا تمھارا تھا ہی نہیں۔ اگر تمھارا ہوتا تو تمھارے پاس رہتا نا۔ وہ جس کا تھا اس نے لے لیا۔ تم کیوں رنج کرتے ہو؟'' ہاشمی صاحب! اس وقت بھی وہ زخم ہرا ہے اور اس وقت بھی وہ مرہم اپنا کام کر رہا ہے۔''(۵) غور طلب بات یہ ہے کہ رنج و افسردگی کے بیان میں بھی مذکورہ بالا ابھار موجود ہے شوخی اور ظرافت کے ساتھ ساتھ سنجیدگی بھی ہے اور باتوں ہی باتوں میں تعزیت کی اہمیت واضح کر دی ہے۔

اپنی عمر کے آخری زمانے میں چودھری صاحب پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ اس دوران وہ اپنی عزیز بیٹی ہما بیگم کو اپنی علالت کا حال اپنے ۱۲ نومبر ۱۹۵۵ء کے خط میں اس طرح تحریر کرتے ہیں:

"تم نے میرا حال دریافت کیا ہے۔ سنو! میرا بایاں ہاتھ بالکل بے کار ہے۔ مگر خفیف سی جنبش اختیار میں ہے۔ بایاں پاؤں اُٹھ جاتا ہے، لیکن اگر کوئی طاقت ور آدمی مجھ کو پکڑے نہ رہے تو میں گر پڑوں۔ یعنی مفلوجِ محض ہوں... موٹا ہو گیا ہوں، یعنی نوکروں کو اٹھانے میں اور تکلیف ہوتی ہے۔ فرنچ داڑھی رکھوالی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں اچھی معلوم ہوتی ہے۔ معلوم نہیں اللہ میاں کو بھی اچھی لگے گی یا نہیں۔ میری مجبوریوں کا حال نہ پوچھو۔ یہ کارڈ تب لکھ سکا ہوں، جب دوسرا آدمی اس کے کونے پکڑے ہے۔ اگر آرام کرسی پر چھپکلی گر پڑے تو میں مجبورِ محض ہوں خود نہیں اُٹھ سکتا۔" (۷) اس کے چند ہفتوں بعد، اپنے ۴ر جنوری ۱۹۵۶ء کے خط میں اپنی مزید بگڑتی علالت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"پیٹ کی خرابی کو تو میں بھول گیا۔ مگر موت کی یاد ویسی ہی ہے۔ قلب کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ جیسے کوئی پرانا ستار تانپورہ ہو جس کے تار اترے ہوئے، کھونٹیاں ڈھیلی ڈھالی پڑی ہوں، اور چوہا بھی اس پر سے دوڑ جائے تو تمام تار بے سرے جھن جھن کرنے لگیں۔ یہ حال ہمارے قلب سلیمہ کا ہے۔ چناں چہ رات بہت کم سوئے۔ منوم دوا جو عورتوں کو ہسٹریا میں دی جاتی ہے وہ بھی پی، مگر یہ حال رہا کہ ہم سمجھے کہ ہم جاگ رہے ہیں۔ اور گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا تقریباً چار گھنٹے ہوئے۔ یہ حال ہے بی بی کہ سوتا بھی ہوں تو معلوم ہوتا ہے جاگ رہا ہوں۔" (۷)

ان دونوں خطوں میں چودھری صاحب اپنی علالت اور اپنی تکالیف و پریشانیوں کا ذکر کرتے ہیں مگر اپنی ظریفانہ طبیعت کی وجہ سے ان کی تحریر میں شگفتگی برقرار رہتی ہے۔ شوخی و شرارت جو ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے وہ ہر مقام پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ خواہ خوشی کا مقام ہو یا غم کا، وہ نچلے نہیں بیٹھتے۔ ضعیفی میں جہاں تمام اعضا ڈھیلے پڑنے لگتے ہیں قلب کی رفتار میں بھی فرق آنے لگتا ہے، اس کی مثال چودھری صاحب نے یہاں بڑے ہی مزاحیہ انداز میں پرانے ستار تانپورہ پر کسی چوہے کے دوڑ جانے سے پیدا ہونے والی جھنجھاہٹ سے دی ہے۔ چوں کہ وہ ہما بیگم کو اپنی دوست کی طرح ہی تصور کرتے تھے۔ ان سے بہت بے تکلف تھے، اس لیے وہ اپنے ۲۲ر ستمبر ۱۹۳۲ء کے خط میں اپنے نوکروں کے خاندان کی ایک بہو کا تذکرہ کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

"دلہنیا کے لڑکا ہونے والا ہے۔ دن قریب ہوں گے۔ گو قریب تر نہیں معلوم ہوتے۔ وہ بہت خوش ہے۔ باورچی خانے سے دری آتے وقت ذرا سا سر جھکا کر کنکھیوں سے اپنا پیٹ دیکھتی چلتی ہے۔ مجھ کو نہ معلوم آپ ہی آپ کیوں خوشی ہے۔ مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ گویا میرے ہی پوتا پیدا ہونے والا ہے۔" (۸)

اس تحریر کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ چودھری صاحب کی نظر کتنی تیز تھی۔ وہ نباضِ فطرت تھے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کس خوبصورت انداز میں کرتے تھے۔ شوخی و ظرافت کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال ہی لیتے تھے۔ چوں کہ وہ فطرتاً خوش مزاج اور شوخ طبیعت کے مالک تھے اس لیے ان کی تحریر میں ہر جگہ اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ چودھری محمد علی کی تحریروں کا سب سے اہم موضوع عورت ہے۔ انھوں نے ہر زاویہ سے عورت کا مطالعہ کیا ہے۔ ایک نوجوان عورت جب پہلی بار حاملہ ہوتی ہے تو بعد ازاں رونما ہونے والی تکالیف سے ناآشنا ہوتے ہوئے اسے ایک گونہ مسرت ضرور حاصل ہوتی ہے۔ اسی کیفیت کو چودھری صاحب نے

یہاں طنزیہ پیرائے میں بڑی خوبصورت مثال سے واضح کیا ہے۔ اسی طرح اپنے دوست عزیز صاحب، جن کا تعلق اعظم گڑھ سے تھا، ان کو ۶/اپریل ۱۹۵۱ء کو ایک خط میں نوکروں کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"چند آدمی اجمیر شریف کی زیارت سے واپس آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ جو نوکر تھا نہایت بے وقوف تھا۔ وہ لوگ لکھنؤ آرہے تھے۔ سندیلہ وغیرہ کے اسٹیشن پر اس کو روپیہ توڑانے بھیجا۔ اس نے روپیہ توڑایا اور آٹھ آٹھ آنے پیسے دونوں مٹھیوں میں لے کر ریل کی طرف بڑھا۔ اتنے میں ریل چھوٹ گئی۔ اب وہ برابر گاڑی کے ساتھ دوڑا چلا جاتا ہے۔ مگر ریل پر چڑھتا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ پلیٹ فارم ختم ہو گیا اور وہ رہ گیا۔ لکھنؤ پہنچ کر بڑی دقت کا سامنا ہوا۔ کیوں کہ قافلہ بھر کے ٹکٹ اسی کے پاس تھے۔ خیر بہزار خرابی ان غریبوں کی جان اسٹیشن والوں سے چھوٹی۔ کچھ گھوس بھی دینا پڑی۔ شام کی گاڑی سے ملازم صاحب آئے آقا غصے میں بھرے بیٹھے تھے کہنے لگے۔

"ابے تو تو برابر ریل کے ساتھ دوڑا کیا۔ اور گاڑی پکڑ کر چڑھ کیوں نہ آیا۔"

نوکر: میاں دونوں ہاتھوں میں تو پیسے تھے، گاڑی کا ڈنڈا کیسے پکڑتن۔

آقا: ابے پیسے ایک ہاتھ میں لے لیتا دوسرا ہاتھ خالی ہو جاتا۔

نوکر: واہ میاں اب ترکیب بتاوے چلے ہو۔ اوبیر نہ بتلائیو۔

آقا: اور مردود سب کے ٹکٹ بھی تیرے ہی پاس تھے۔

نوکر: لیو میاں اپنے ٹکٹ لیو، گسا کاہے کرت ہو۔" (۹)

یہ کوئی افسانہ یا ڈراما نہیں بلکہ خط کا ایک حصہ ہے۔ چودھری صاحب محض کسی شے، کسی واقعہ، کسی سین کو بیان ہی نہیں کرتے، بلکہ اسے نظر کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں اور پوری تصویر صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔ گویا پورا منظر نظروں کے سامنے کھنچ جاتا ہے اور یہی ان کے اندازِ تحریر کی خصوصیت ہے۔ نوکر دیہاتی تھا، انتہائی سادہ لوح اور بے وقوف بھی تھا۔ شہر کی تیزی اور چالاکی سے قطعاً ناواقف تھا۔ لہٰذا اس سے پے در پے جو حماقتیں سرزد ہوئیں، اس کی منظر کشی مزاحیہ انداز میں چودھری محمد علی نے بہت خوبصورت اور مناسب الفاظ میں کی ہے اور یہی ان کے اندازِ تحریر کی خصوصیت ہے۔ "گویا دبستاں کھل گیا" میں جمع شدہ ان کے تمام خطوط ظرافت کے بیش بہا نمونوں سے بھرے پڑے ہیں اور یہ ایسے نمونے ہیں جو خالص ظرافت کے نمونے ہی نہیں بلکہ ادبی معیار پر بھی پورے اُترتے ہیں۔ ان میں تخیل کی باریک بینی، تیزی اور بلند پروازی ہے۔ تحریر میں جابجا شوخی، رنگینی، بے ساختگی، بوقلمونی اور قوتِ ایجاد کے نمونے نہ صرف بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ ان کو پڑھ کر چودھری صاحب کی ذہنیت کی گہرائی اور پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

چودھری صاحب کے افسانوں، کہانیوں اور مضامین میں طنز و مزاح:

اردو نثر میں طنز و مزاح کی کمی نہیں ہے۔ اردو ادب کے نامور نقاد کلیم الدین احمد نے مزاح نگاروں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے "پہلے گروہ میں وہ انشاپرواز ہیں جن کا نصب العین خالص ظرافت ہے اور جو ہنسنے ہنسانے کے علاوہ کوئی دوسرا اندرونی مدعا نہیں رکھتے اور اگر رکھتے بھی ہیں تو اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ دوسرا گروپ پُر مقصد ہے جو نقائصِ انسانی، سماجی، تمدنی، اخلاقی و سیاسی غرض ہر قسم کے نقائص کو مٹانا چاہتا ہے... اس گروپ کے انشاپرداز کا جذبۂ غضب جوش میں آتا ہے اور وہ اس جذبۂ غضب کی اپنی ہجوؤں میں ترجمانی کرتا ہے۔ اس قسم کے انشاپرداز خالص طنز کے عوض ظرافت اور طنز، اور زیادہ تر طنز سے مصرف لیتے ہیں... تیسرا گروپ وہ ہے جس کی ظرافت میں فلسفیانہ رنگ ہوتا ہے۔ یہاں مقصد ظرافت نہیں بلکہ اپنے فلسفۂ زندگی یا ان مشاہدوں کی جن پر فلسفہ کی بنیاد ہے ظرافت آمیز نقاشی ہے۔" (۱۰)

چودھری محمد علی کا تعلق اس تیسرے گروپ سے ہے۔ چودھری صاحب نے اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان ہے "بیوی کیسی ہونا چاہیے" عورت کے بارے میں اپنے فلسفیانہ خیالات کا کچھ اس طرح اظہار کیا ہے "مجھ سے سوال کیا گیا کہ بی بی کیسی ہونا چاہیے؟ میں کہتا ہوں کہ کوئی بُری بی بی مجھ کو دکھا دے تو میں اس سوال کا جواب دوں۔ میرے خیال میں بی بی خدا کی نعمت ہے اور خدا کی نعمت کبھی بُری نہیں ہوتی۔ بیوی کی وجہ سے گھر میں روشنی سی پھیلی رہتی ہے۔ چراغ کے نیچے ذرا سا اندھیرا بھی ہوتا ہے... اگر کوئی نادان مزدوری سی تاریکی سے گھبرا کر چراغ کی شکایت کرے تو اندھیر ہی تو ہے۔ میں اس کا بھی دعوے دار ہوں کہ میں نے آج تک کوئی بدصورت عورت بھی نہیں دیکھی۔ آنکھیں رکھتا ہوں اور دنیا دیکھی ہے، اگر کہیں ہوتی تو آخر میں نہ دیکھتا۔" (۱۱)

چودھری صاحب عورت کے بارے میں بہت ہی بلند خیالات اور نیک تصورات رکھتے تھے۔ وہ عورت کی ہر ہیت، ہر ادا، ہر انداز اور ہر طریقہ زندگی کو اچھا ہی سمجھتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ عورت ان کی کمزوری تھی لیکن وہ اپنی فلسفیانہ نگاہوں سے اسے اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا ایک حسین پیکر تصور کرتے تھے۔ ان کا فلسفہ تھا کہ عورت نام ہی ہے حسن و جمال کا۔ اچھائی اور برائی ہر انسان کی فطرت میں شامل ہوتی ہے۔ چوں کہ حسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے اور ہر انسان اپنے خیالات کے مطابق اس کا تجزیہ کرتا ہے۔ اس مضمون میں دراصل چودھری صاحب نے ان لوگوں پر طنز کیا ہے، جو اپنی بیویوں میں نقص نکالتے ہیں اور دوسروں کی بیویوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔

چودھری محمد علی اپنے تحریر کردہ مضمون "عشق بالواسطہ" کا آغاز کچھ اس طرح کرتے ہیں: "لارڈ کرزن ہندوستان کے سابق وائسرائے اور انگلستان کے مشہور سیاست داں کی بابت مشہور تھا کہ وہ "میں" کا استعمال بہت کرتے تھے۔ قیصر ولیم شہنشاہ جرمنی میں بھی لوگ یہی عیب بتاتے تھے۔ نفسیات کے ماہرین کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ اپنی انانیت کی وجہ سے وہ ٹھوکریں کھائیں گے کہ ان کے مرنے کے بعد بھی دوسرے یاد رکھیں گے۔ وہ دونوں تو چل بسے۔ اب اس زمانے میں ایک ہم ہی خودی کے قدر دان رہ گئے ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔ تو ہم بھی کب تک۔ ناظرین کو اگر میری بات میں شک ہو تو واحد متکلم کا صیغہ اس تحریر میں گنتے جائیں ہاتھ کنگن کو

آرسی کیا ہے۔ معلوم ہی ہو جائے گا، میرے ان دونوں ہم خیالوں میں صفات یہی تھے جن کو سراہتے ہیں ان کو لطف آتا تھا۔ ہم میں ذری صفات کی کمی رہ گئی ہے۔ اس لیے ہم اپنے عیوب ہی کا ذکر کر کے سڑا سامنہ سوندھا کرتے ہیں۔ عیوب کا لفظ تو ہم نے مصنف خوار معترضین کا منہ بند کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اگر ہم ان کو واقعی عیب سمجھتے تو بیان ہی کرنے کیوں بیٹھتے۔" (۱۲)

اپنے اس مضمون میں چودھری محمد علی نے جو مزاحیہ انداز اختیار کیا ہے اس میں فلسفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ وہ کسی کے عیب کو جب بیان کرنا چاہتے ہیں تو اس بات کو اپنے اوپر رکھ کر مزاحیہ انداز میں بہت ہی خوبصورت طنز کر جاتے ہیں۔ ان کے مزاح میں گہرائی پائی جاتی ہے۔ لفظ "میں" کثرتِ استعمال سے مراد انانیت اور خود پسندی کا اظہار ہے۔ ایسا لفظ استعمال کرنے والا شخص صرف اپنی ذات اور اپنی پسند کو ہی اہمیت دیتا ہے اور دوسروں کو قطعاً خاطر میں نہیں لاتا۔ ایسے انسان کی زندگی میں کیا مضمرات ہوں گے اور مطلق العنانی کا دوسروں پر کیا اثر پڑے گا ان تمام پہلوؤں پر چودھری محمد علی نے اس مضمون کی تمہید میں طنزیہ انداز سے روشنی ڈالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

چودھری محمد علی ردولوی کی ہر تصنیف خواہ افسانوں پر مشتمل ہو یا خاکوں، کہانیوں، انشائیوں یا دیگر مضامین پر ان کا طنز و مزاح کا یہ منفرد انداز جس میں پختگی بھی ہے اور گہرائی بھی ہر جگہ نمایاں ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فلسفیانہ طنز و مزاح کے لیے بیساختگی اور برجستگی موزوں نہیں مگر ان کی تحریر میں یہ دونوں خصوصیات پائی جاتی ہیں جس سے ان کی تحریر کے حسن میں اضافہ ہو جاتا اور قاری اسے پڑھ کر محظوظ ہوتا ہے۔ جو بات چودھری صاحب کی تحریروں کو ممتاز بناتی ہے وہ غور و فکر کا وجود، خیالات و تجربات کی گہرائی اور سنجیدہ اور متین لب و لہجہ ہے۔ مثلاً چودھری محمد علی نے اپنی تصنیف کردہ کتاب "گناہ کا خوف" میں ایک مضمون "آنکھوں کی زبان" کے عنوان سے تحریر کیا ہے اس میں انھوں نے مردوں کے بارے میں ایک عورت کے ذہن کی عکاسی خوبصورت انداز میں کی ہے لکھتے ہیں:

"ہم عورتیں اگر کسی کو دیکھیں تو جنس کے خیال سے، اگر کسی کو دکھائیں تو جنس کے خیال سے۔ کپڑے پہنیں تو مرد کے لبھانے کو۔ ہاتھ، کان، گلے میں کچھ ہو تو مرد کی لونڈی بننے کو۔ کوئی کمال حاصل کریں تو شوہر پھانسنے کو، خوبصورت ہوں تو مرد کے لیے۔ بدصورت ہوں تب بھی مرد کی کسوٹی پر کس کر پھینک دیے جانے کو۔ خدا کے لیے انصاف کیجیے گا۔ آٹھوں پہر میں گھڑی دو گھڑی تو ایسی ہونی چاہیے جب آپ لوگ ہماری جان چھوڑدیں، اور جنس کے لنجھیڑے سے دم مارنے کی فرصت نکلے۔ اور ہم لوگ خود اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ ... آخر کسی وقت تو عورت کو مرد کا بت پوجنے سے چھٹی ملنی چاہیے۔ اس کو میں مانتی ہوں کہ ہماری تعلیم، ہماری تربیت، ہمارے قوانین، خود ہمارے جسم کی بناوٹ ایسی واقع ہوئی ہے کہ سوا مرد کے استھان پر بھینٹ چڑھ جانے کے ہمارا کوئی مصرف نہیں۔ لیکن پھر بھی میں یہ ماننے پر تیار نہیں ہوں کہ سوا جنس کے کوئی پہلو ہماری زندگی کا ہو ہی نہیں سکتا۔ اور پیدا کرنے والے نے ہم کو صرف اس واسطے پیدا کیا ہے کہ آپ کی خدمت کیا کریں اور بس۔ ہاتھ، پاؤں، دل و دماغ صرف اس واسطے پیدا کیے گئے ہیں کہ مرد کے لیے جیو اور مرد کے لیے مر جاؤ۔ اگر کسی وقت بھول بھی جاؤ تو پردہ نگوڑا شرم کی باتوں سے خیال ہٹنے نہیں دیتا۔" (۱۳)

اس تحریر میں چودھری صاحب نے ان مردوں پر طنز کیا ہے جن کے نزدیک عورت صرف بچہ پیدا کرنے کی مشین ہوتی ہے، یا مردوں کا دل لبھانے کے لیے، ان کا ہر حکم ماننے کے لیے عالم وجود میں آئی ہے۔ ایک عورت اپنی زندگی کے بارے میں، اپنے وجود کے بارے میں کیسے خیالات رکھتی ہے اس سلسلے میں چودھری محمد علی نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں یا جو انداز اختیار کیا ہے وہ دوسرے مزاح نگاروں کے مقابلے میں نہ صرف منفرد ہے بلکہ اعلیٰ درجے کا ہے اور معیاری بھی ہے۔ وہ سستی شہرت کے طلب گار نہیں اس لیے وہ سطحی اور عام پسند قسم کی چیزوں سے احتراز کرتے ہیں۔ لہٰذا سطحی رنگینی اور سطحی رعنائی کبھی ان کا مطمح نظر نہیں رہا۔

''اسباب کا غلام'' کے عنوان کے تحت چودھری صاحب ایک مضمون لکھتے ہیں، جس میں ایک انگریز نوجوان میں حاکمیت حاصل ہو جانے کے بعد رعب و دبدبہ کا اظہار کس طنزیہ انداز میں کرتے ہیں۔ ''پانچ ہی برس کے اندر وہ جواں رعنا اپنے ٹھکانے لگ چکا تھا اور اس کی جگہ ایک عجیب الخلقت آدمی کرسی پر بیٹھا تھا۔ بجائے قدیمی ہنس مکھ چہرے کے ایک صورت سامنے تھی، جس میں دہانے کے ادھر ادھر دو شکنیں، ہونٹوں کے سروں کو اس طرح نیچے کھینچ لائی تھیں جیسے دو سنتری تعنیات ہوں کہ یہ گنہگار ہنسنے نہ پائے۔ سر کے بالوں کا قافلہ روا رو میں تھا اور آنکھوں کے کوئے ایسے پھٹ گئے تھے گویا وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں ''ہم رات کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے۔'' چہرے کے پٹھے گویا مفلوج ہو گئے تھے جن میں خوشی، رنج، تعجب، شوق ظاہر کرنے کی قابلیت ہی نہیں رہ گئی تھی۔'' (۱۴)

طالب علمی کا دور بڑی بے فکری اور لاپرواہی کا دور ہوتا ہے۔ انسان اس دوران اکثر الٹی سیدھی حرکتیں کرتا ہے، شرارتیں بھی کرتا ہے۔ ہنسی مذاق کرتا ہے اور لوگوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔ مگر جب انسان کو حصولِ علم کے بعد کوئی اہم انتظامی کرسی پر بیٹھنا پڑتا ہے تو اسے سنجیدگی اور بردباری اختیار کرنا پڑتی ہے۔ شوخی اور چلبلاہٹ کو خیر باد کہنا پڑتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ یہ سنجیدگی اور متانت اس کے چہرے کے خدوخال اور نقش و نگار کو ہی بدل دیتی ہے۔ اور اس مضمون میں چودھری صاحب نے اسی تبدیلی کا نقشہ بڑے ہی خوبصورت اور طنزیہ انداز میں کھینچا ہے۔

چودھری صاحب کا مزاح فطری ہے۔ اس کے تخیل میں غیر معمولی باریک بینی اور بلند پروازی ہے۔ اس میں ایک زور ہے ایک اثر ہے، اور یہ زور و اثر اور روانی فطری ہے۔ اس وجہ سے اس میں گرانی نہیں بلکہ لطافت پائی جاتی ہے۔ بقول چودھری صاحب کے کہ ایک صاحب قصہ بیان کرنے سے پہلے قصہ گوئی کے رموز کے بارے میں یوں گل افشانی فرماتے ہیں: ''فنِ مصوری میں استاد لوگ درخت اور باغ کہیں سے، عمارت کہیں سے، بادل کسی اور ملک سے لے کر تصویر مکمل کرتے ہیں۔ اگر اسی طرح میں بھی گاؤں، ٹھاؤں، ناؤں، اور زمانہ بدل دوں تو اعتراض نہ کیجیے گا... حافظ کے دیوان سے لوگ فال نکالتے ہیں، جس میں ہر شخص کو آپ بیتی مل جاتی ہے۔ مگر آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی کہ تمام فال کھولنے والوں کا پتہ بھی حافظ کو نہ تھا۔ اسی طرح اگر میری گزارش میں کوئی بات فطرت کے موافق نکل آئے تو ممکن ہے کہ مجھ پر گزری ہو، ممکن ہے ہم آپ دونوں پر گزر چکی ہو یا آئندہ گزرے۔ خیر ہم پر اب کیا گزرے گی آپ لوگوں پر گزرے۔'' (۱۵)

ایک مصور کسی منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس کے مختلف اجزا نہ جانے کہاں کہاں سے لا کر جمع کر دیتا ہے، صرف حسن و خوبصورتی پیدا کر دینے کی خاطر۔ بالکل اسی طرح کوئی کہانی بیان کرنے کے لیے ایک اچھا قصہ گو مکان، زبان اور کرداروں کے نام وغیرہ ادھر اُدھر سے لا کر قصے میں جان ڈالنے کی کوشش میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔ اور یہ ساری باتیں مبالغہ آرائی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتیں۔ بالکل اسی طرح جیسے لوگ حافظ شیرازی کے دیوان سے فال نکالتے ہیں، حالاں کہ بے چارے حافظ شیرازی ایک عام انسان تھے اور نعوذ باللہ پوری دنیا میں بسنے والے انسانوں کے مستقبل سے تو واقف تھے نہیں۔ غیب کی باتیں تو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ مگر لوگ انتہا درجہ کی مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہوئے اس دیوان سے ہر ایک کے مستقبل کا حال نکال لیتے ہیں۔ انھیں موضوعات کو چودھری محمد علی نے بڑی چابکدستی سے طنزیہ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

کہیں کہیں چودھری محمد علی کا لب و لہجہ بہت زیادہ متین و سنجیدہ ہو جاتا ہے وہ تمسخر سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے قلم سے پھبتیاں نہیں نکلتیں۔ وہ نہایت بے تکلفی سے قہقہے نہیں لگاتے اور نہ دوسروں کو قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ پروقار انداز سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور ان خیالات میں بڑی گہرائی ہوتی ہے۔ طنز کے ساتھ ساتھ ان کی سنجیدگی، شگفتگی، لطافت اور باریک بینی برقرار رہتی ہے۔ مثلاً ٹیگور کے بارے میں چودھری محمد علی ایک مضمون میں یوں رقم طراز ہیں "سمپسن جب اندھا کر دیا گیا، تو اس نے کہا روشنی کی ایسی نعمت اتنی چھوٹی، مختصر اور نازک جگہ میں کیوں رکھی گئی کہ جس بدتمیز کا دل چاہے اس کو بگاڑ کر اندھیر کر دے۔ ارے اس کو تو سر سے پاؤں تک ہر جگہ ہونا چاہیے کہ اگر کوئی مٹانا بھی چاہے تو نہ مٹا سکے۔ یہی حال اچھے آدمیوں کی زندگی کا ہوتا تو خوب تھا۔ اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ ٹیگور اگر صرف اسّی برس جئے تو کیا جئے۔ ان کو تو اس طرح جینا چاہیے تھا کہ جیسے ان کی شاعری زندہ رہے گی۔" (۱۶)

انگریزی ادب کا مشہور شاعر سمپسن جب نابینا ہو گیا تو اسے آنکھوں کی روشنی کا اندازہ ہوا اور اس نے بڑی خوبصورت بات کہی کہ آنکھ کی یہ روشنی اس قدر اہم ہے کہ اسے انسان کے سارے جسم میں سرایت شدہ ہونا چاہیے تاکہ یہ حیات انسانی تک قائم و دائم رہے۔ اسی بات کو چودھری صاحب نے ٹیگور کی شاعری سے انتہا درجہ متاثر ہو کر طنزیہ انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ انھیں تو خود اسی طرح جاوداں رہنا چاہیے تھا جیسے ان کی شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی۔

وزیر آغا نے کامیاب مزاح نگاری کے اظہار کے لیے چار طریقہ ہائے کار بتائے ہیں۔ "مزاح نگاری اپنے نمود کے لیے جن عناصر کی رہین منت ہے ان میں سے ایک موازنہ ہے... دوسرا زبان و بیان کی بازی گری ہے... مزاح نگاری کا تیسرا حربہ پیروڈی یا تحریف ہے۔" (۱۷) چودھری محمد علی ردولوی کی تحریر میں ہمیں طنز و مزاح سے متعلق وزیر آغا کے وضع کردہ یہ چاروں عناصر گاہے گاہے نظر آتے ہیں۔ دو چیزوں کی آپس میں بیک وقت مشابہت اور تضاد سے وہ ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں جو ہنسی کو بیدار کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ چودھری صاحب نے کہیں کہیں اس حربے سے استفادہ کیا ہے۔

عام زندگی میں موازنے کی مثال کسی شریر آئینے کا وہ عکس ہے جو کسی فرد کو مضحکہ خیز حد تک بگاڑ دیتا ہے۔ یہ عکس بیک وقت

اس فرد کا اصلی عکس بھی ہے اور اس سے قطعاً مختلف بھی اور اسی لیے یہ مزاح کو پیدا کر دیتا ہے مثلاً ایک عمر رسیدہ شوہر اور کمسن بیوی کے خیالات کے فرق پر چودھری صاحب کس خوبصورتی سے طنز کرتے ہیں۔ "ایک بڑے بدصورت، ادھیڑ میاں اور ایک خوبصورت کمسن بی بی راستے میں چلے جاتے تھے۔ بی بی نے ایک کتے کی جوڑی دیکھی، جو دونوں ایک ہی طرح کے تھے۔ میاں سے کہنے لگیں ایسا جوڑ ملتے بھی کم دیکھا ہوگا۔ انھوں نے جواب دیا ساتھ رہتے رہتے پہلے خیالات اور پھر صورت ملنے جلنے لگتی ہے۔ بی بی کا جی دھک سے ہو گیا، کہنے لگیں میری جان کیا ہمیشہ یہی ہوتا ہے؟" (۱۸)

شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے:

صحبتِ صالح ترا صالح کند

صحبتِ طالع ترا طالع کند

صحبت کا اثر لینا تو فطرتِ انسانی ہی نہیں بلکہ ہر جاندار کی فطرت بھی ہے۔ یہ کسی بھی جاندار کے ماحول کا اہم ترین جزو ہوتا ہے۔ ماحولیات کے اسی اہم نکتہ کو یہاں چودھری صاحب نے بہت ہی اچھی مثال دیتے ہوئے طنزیہ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

صورتِ واقعہ سے پیدا ہونے والا مزاح وہ ہے جو کسی شعوری کاوش کا رہینِ منت نہ ہو بلکہ از خود حالات و واقعات کی ایک مخصوص نہج یا کردار کی مخصوص ناہمواریوں سے پیدا ہو جائے۔ چناں چہ ایک اچھا مزاح نگار غلطی، غلط فہمی اور اتفاقِ وقت سے بھی کام لیتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کوشش کرتا ہے کہ عملی مذاق سے بہت کم مدد لے۔ چودھری محمد علی کا تحریر کردہ ایک مضمون جس میں وہ ماہِ رمضان میں ایک دکان پر ایک خریدار اور دکاندار کی جھڑپ کا نقشہ کس انداز سے کھینچتے ہیں، "ان حضرات کے منہ سے جھاگ اُڑ رہی تھی۔ لہریں نہیں بلکہ جوار بھاٹے آ رہے تھے۔ ہونٹوں کے کناروں پر سمندر پھین جمتا جاتا تھا۔ اور ان دو نیک لوگوں میں ہم روزہ خور، گناہ گار پھنس گئے تھے۔ ان کے منہ سے خوشبوؤں کے بقعے بھق بھق اُڑ رہے تھے۔ اور ہم محسوس کر رہے تھے کہ روزہ نہ رکھنے کے عذاب میں گرفتار ہیں۔" (۱۹)

بعد از عصر روزے کی تکان اور بڑھ جاتی ہے۔ خالی معدہ دماغ انسانی کو زیادہ متاثر کرنے لگتا ہے۔ پیاس کی شدت مزید بڑھ جاتی ہے۔ اور اگر اس حالت میں غصہ آ جائے تو ایسے انسان کی کیا کیفیت ہوگی؟ اسی حالت کا شکار دو لوگوں کے لڑنے جھگڑنے کا نقشہ چودھری صاحب نے اپنے اس مضمون میں کھینچا ہے اور ساتھ ہی ساتھ طنز اس بات پر ہے کہ انسان مذہبی فرائض کے دوران اگر نفسِ امارہ پر قابو رکھ سکے تو یہی مقصدِ عبادت ہے۔

مزاحیہ کردار کی بدولت تمام ماحول مضحکہ خیز صورت اختیار کر جاتا ہے۔ مزاحیہ کرداروں کو نمایاں کرنے کے لیے پہلے ایک مناسب ماحول پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ایک کامیاب مزاح نگار کردار کے اجزا یا عناصر کے مابین اس خلیج کو نمایاں کر کے دکھاتا ہے، جس سے ناظر کو کردار کی ناہمواریوں کا احساس ہو سکے۔ چناں چہ مزاح نگار کی نظر انتخاب ایک ایسے کردار پر پڑتی ہے جس میں لچک کا فقدان ہوتا ہے۔ چودھری صاحب ایک ایسے ہی دلچسپ کردار کو کس طرح تراشتے ہیں:

"ایک تھے میاں حسنو، قوم کے فقیر کہلاتے تھے مگر ہم کو تو قلمی ہی سے معلوم ہوتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ نہ تکیہ نہ قبرستان نہ کسی بزرگ سے نسبت نہ مجاوری، پیالے کی آیت تک یاد نہ تھی۔ بھیک بھی وضع داری سے مانگ لیتے تھے ورنہ جھولی، کشکول، تونبی، دسپنا، فقیری کے تمغوں میں سے کچھ بھی تو نہ تھا۔ کنٹھے گوریاں بھی گلے میں کبھی نہ دیکھیں۔ البتہ اذان دے لیتے تھے۔ مسجد بھی قریب نہ تھی۔ اور کسی قبرستان میں کوئی تکیہ دار ان کو کاہے کو اذان دینے دیتا۔ یوں کہیں تازہ قبر دیکھتے تھے تو غلط سلط اذان دے پڑتے تھے۔"(۲۰)

چودھری محمد علی کی ہر تحریر خواہ خطوط ہوں یا افسانے طنز و مزاح کی آمیزش سے بھرپور ہیں، جگہ جگہ مزاح بکھرا پڑا ہے۔ انھوں نے صحیح معنوں میں اردو کو ظرافت اور ظرافت کو ادبی رنگ اور ادبی رنگ کو آفاقیت بخشی ہے۔ ان کی تحریر میں روانی اور اسلوب میں جان ہوتی ہے، جس کی وجہ سے ان کے مزاح کا ادب میں ایک مقام ہے۔ وہ روزانہ کے معاملات، اشخاص کے کردار اور واقعات کے موزوں انتخاب سے کام لیتے ہیں اور بعض چھوٹی چھوٹی باتوں سے ایسا طنز پیدا کرتے ہیں جن میں مزاح ہوتا ہے۔ بات میں سے بات نکالنا اور ہر بات میں نئی بات پیدا کرنا ان کا فن ہے۔ چودھری صاحب نے ہر اس چیز پر طنز کیا ہے جو فرد کی آزادی، سکون اور آسودگی کو تباہ کرتی ہے۔ وہ ڈپٹی کلکٹر ہو یا کپتان، ملازم ہو یا سیاست داں، بنیا ہو یا گاہک، ایڈیٹر ہو یا موسیقار، فن کار ہو یا کفایت شعار بیوی، شاعری ہو یا عدم تعاون، اپنی کمزوری ہو یا دوسروں کی حماقت، غرض انھوں نے ہر ایک کو طنزیہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔

حواشی:

(۱) گویا دبستاں کھل گیا، ص ۱۷ تا ۱۸

(۲) گویا دبستاں کھل گیا، ص ۷۰

(۳) ایضاً، ص ۹۵ تا ۹۶

(۴) ایضاً، ص ۵۲ تا ۵۳

(۵) ایضاً، ص ۱۷۷ تا ۱۱۸

(۶) ایضاً، ص ۳۰۵

(۷) ایضاً، ص ۳۱۷ تا ۳۱۸

(۸) ایضاً، ص ۱۸ تا ۱۹

(۹) ایضاً، ص ۱۳۴ تا ۱۳۵

(۱۰) "اردو میں طنز و ظرافت" کلیم الدین احمد، مشمولہ: نقوش، طنز و مزاح نمبر، ص ۶۱

(۱۱) کشکول، ص ۲۹۹

(۱۲) ''کشکول محمد علی شاہ فقیر''، ص ۳۳ تا ۳۴

(۱۳) ''گناہ کا خوف''، ص ۴۵۴ تا ۴۵۵

(۱۴) ایضاً، ص ۴۴۳

(۱۵) ''کشکول محمد علی شاہ فقیر''، ص ۲۹۲

(۱۶) ایضاً، ص ۳۱۰ تا ۳۱۱

(۱۷) ''مزاح اور مزاح نگاری''، وزیر آغا، ص ۳۶ تا ۳۹

(۱۸) ''کشکول''، ص ۸۰ تا ۸۱

(۱۹) ''کشکول محمد علی شاہ فقیر''، ص ۷۶ تا ۷۷

(۲۰) ایضاً، ص ۱۱۳ تا ۱۱۴

حوالہ جات:

ثریا شمیل (۲۰۰۴ء): ''چودھری محمد علی ردولوی: حیات و فن'' تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، جامعہ کراچی، ۲۸۰

چودھری محمد علی ردولوی (۱۹۳۹ء): ''گناہ کا خوف''، نیا سنسار، لکھنؤ، ۱۳۹ صفحات

چودھری محمد علی ردولوی (۱۹۵۱ء): ''کشکول محمد علی شاہ فقیر''، صدیق بکڈپو، لکھنؤ، ۳۲۶ صفحات

چودھری محمد علی ردولوی (۱۹۵۶ء): ''گویا دبستاں کھل گیا''، بار اوّل۔ اکادمی پنجاب، لاہور، ۲۸۶ صفحات

چودھری محمد علی ردولوی (۱۹۷۷ء): ''گویا دبستاں کھل گیا''، اضافہ شدہ ایڈیشن۔ اردو اکادمی سندھ، کراچی، ۴۰۰ صفحات

چودھری محمد علی ردولوی (۱۹۸۰ء): ''کشکول''، اردو اکادمی سندھ، کراچی، ۶۳۹ صفحات

کلیم الدین احمد (۱۹۵۹ء): ''اردو میں طنز و ظرافت''، مشمولہ نقوش، لاہور طنز و مزاح نمبر، صفحات ۴۹ تا ۸۵

وزیر آغا (۱۹۵۹ء): ''مزاح اور مزاح نگاری''، مشمولہ نقوش، طنز و مزاح نمبر، جنوری و فروری ادارہ فروغ اردو، لاہور، صفحات ۲۵ تا ۴۸

قومی زبان ہر گھر کی ضرورت ہے

تدوینِ کلامِ ذوق

صباحت قمر

محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں بہت سے علمی مغالطوں کو جنم دیا تھا۔ اسی طرح انھوں نے دیوانِ ذوق کی اشاعت سے بھی بہت سے علمی اختلافات کو جنم دیا۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ انھوں نے کلامِ ذوق کی صحت واستناد کو نہایت مشکوک بنادیا۔ خاقانی ہند کے شکوہِ کلام، استادِ شاہ اور ملک الشعرا ہونے کی بنا پر کلامِ ذوق کی علمی ادبی اہمیت مسلمہ ہے۔ اس ساری اہمیت کے پیش نظر مستند کلامِ ذوق کی دستیابی نہایت درجہ اہمیت کی حامل تھی مگر آزاد نے جس اصلاح اور ردوبدل کے ساتھ دیوانِ ذوق شائع کیا تھا اس نے اسے اور زیادہ غیر مستند بنادیا تھا۔ حافظ محمود شیرانی صاحب نے جن ٹھوس شواہد اور دلائل سے اس پہلو کی نشان دہی کی تھی اس کی روشنی میں ضروری تھا کہ کوئی صاحبِ علم کلیاتِ ذوق کی تدوین ازسر نو سرانجام دے تاکہ علمی حلقوں کو اردو کے اس مشہور کلاسیکی شاعر کا مستند کلام دستیاب ہو سکے۔

برصغیر کے مشہور عالم اور محقق ڈاکٹر تنویر علوی نے ذوق کے احوال و آثار پر دادِ تحقیق دینے کے بعد اس اہم کام کی طرف توجہ کی اور کلامِ ذوق سے متعلق بہت سی اُلجھنوں کو حل کیا۔

تنویر احمد علوی کے شیخ ابراہیم ذوق کے سوانح اور شاعری کے متعلق تحقیقی وانتقادی کام کی پہلی جلد کئی سال کی محنت کے بعد دسمبر ۱۹۶۳ء میں منظر عام پر آئی تھی یہ ان کا پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے لیے پیش کیا گیا مقالہ تھا۔ جب کہ کلیاتِ ذوق مجلس ترقی ادب کی طرف سے جنوری ۱۹۶۲ء میں شائع کیا گیا۔ انھوں نے ایک طرح سے تدوین کا مذکورہ کام ذوق کی سوانح و شاعری پر تحقیق کے زمانے میں ہی شروع کرلیا تھا۔ عملی ضرورت کے تحت فاضل محقق نے ڈگری کے لیے اپنا مقالہ سوانح اور شاعری کے تحقیقی کام تک محدود کرلیا تھا اور تدوین کلام ذوق کو موخر کردیا تھا۔

تنویر احمد علوی نے جو کلام مرتب کیا ہے وہ مختلف اعتبار سے مستند ہے یہاں تک کہ ذوق ہر غزل یا نظم کے آغاز میں یا اختتام کے طور پر جو لفظ لکھ لیتے تھے وہ بھی بجنسہٖ محفوظ رکھے گئے ہیں۔ تمام خدمات کی نشاندہی کردی گئی ہے۔ اب تک ذوق کے جتنے نسخہ ہائے دیوان مجموعہ ہائے اشعار یا انتخابات شائع ہوئے ہیں نگارستان سخن کو مستثنیٰ کرتے ہوئے سب کے سب نسخہ ویران یا نسخہ آزاد پر

مبنی ہیں یا ان سے ماخوذ ہیں۔

1۔ کلامِ ذوق مآخذ میں جس شکل میں دستیاب تھا تنویر احمد علوی نے اسے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

حصہ اول: اس میں وہ تمام کلام شامل ہے جس کی تصدیق معبو دات ذوق پر بیاض، دیگر علمی مآخذ، ذوق کے ہم عصر تذکروں اور قدیم دواوین سے ہوتی ہے مولانا آزاد روایت (سوائے چند ایک مقامات کے) اس میں شامل نہیں ہے۔

حصہ دوم: یہ حصہ مولانا آزاد کے مرتب کردہ دیوان میں شامل غزلوں، قصائد اور اشعار پر مبنی ہے یہ تمام اشعار صرف مولانا آزاد کے مرتبہ دیوان ہی میں ملتے ہیں اور کسی دوسرے ذریعے سے ان کی تصدیق نہیں ہوتی۔

حصہ سوم: ذوق کے فارسی کلام پر مشتمل ہے۔

2۔ غزلوں اور قصائد کی ترتیب وہی رکھی گئی ہے جو نسبتاً زیادہ قدیم اور مستند مآخذ میں ملتی ہے۔ جو اشعار بنیادی مآخذ میں نہیں ملتے لیکن دیگر ثانوی مآخذ میں موجود ہیں انھیں بالترتیب درج کیا گیا ہے۔

3۔ تصحیح و تعینِ متن کے ضمن میں زیادہ قدیم اور مستند مآخذ کو ترجیح دی گئی ہے نیز ذوق کی اپنی روایت کو مرجع سمجھا گیا ہے اور اس کے مقابلے میں کسی دوسرے نسخے کو صرف اس حالت میں لائق ترجیح تصور کیا گیا ہے۔ جب نمایاں طور پر اس میں زبان، خیال یا بندش کے اعتبار سے زیادہ چستی و درستی نظر آئی۔

4۔ اختلافاتِ نسخ حواشی میں درج کیے گئے ہیں۔ ذوق نے اپنے بعض مسودوں میں خود اصلاح کی ہے لہٰذا متن میں ذوق کی اصلاح کردہ صورت کو ترجیح دی گئی ہے۔ اصلاحات کی وضاحت اور ابتدائی صورت کی نشان دہی حواشی میں کی گئی ہے۔

5۔ ذوق کے یہاں املا کی بعض قدیم صورتیں بھی پائی جاتی ہیں مثلاً "میں نے" کی بجائے "مینے" اور اس سے قدیم املائی صورت "اسے" کو اختیار کیا گیا ہے۔ اسی طرح مجھ کو، کی املا 'مجکو' اور 'مجھے' کی 'مجے' اختیار کی گئی ہے۔ مدون نے متروک املائی صورت کی بجائے ان الفاظ کو مروجہ املا میں لکھا ہے تنویر احمد علوی اگر یہاں وہ املائی صورت درج کرتے جو ذوق کی اختیار کردہ تھی تو زیادہ بہتر ہوتا مروجہ املائی صورت کو قاری کی سہولت و رہنمائی کے لیے پاورق میں لکھا جاسکتا تھا کیوں کہ شاعر کے متروکات و مختارات اور املائی رویوں سے اس کے لسانی رویوں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور ان کے ارتقائی مراحل جاننے میں بھی مدد ملتی ہے۔

6۔ مدون نے متن میں ملفوظی صورت کو برقرار رکھا ہے۔ جب کہ مکتوبی صورت کو ختم کر دیا گیا ہے متن میں کتابت کی اغلاط درست کر دی گئی ہیں اور جو حصے قابل قرأت نہیں وہاں نقطے لگائے گئے ہیں جہاں کہیں قیاسی تصحیح کی گئی ہے یا اشعار کے الفاظ میں اضافہ کیا ہے اسے قوسین میں درج کرنے کا التزام کیا گیا ہے۔

مقدمے میں ذوق کے آغازِ شعر گوئی، قدرتِ سخن، کثرتِ کلام ترتیب و تدوین کی طرف سے مرحوم کا تغافل، اس کے

اسباب و علل، نسخہ ویران، نگارستان سخن اور آزاد کی روایت زیر بحث آئی ہے۔ ذوق کی اپنی تحریروں اور بعض دیگر مسودوں کی مدد سے اس کی نوعیت پر تفصیلی مباحث نیز کلامِ ذوق کا مطبوعہ و غیر مطبوعہ مآخذ کا تعارف کرایا گیا ہے اس دور کے اخبارات کا ذکر بھی موجود ہے خاص طور سے دلی اردو اخبار" جس کے مالک و مدیر والدِ آزاد مولوی محمد باقر، ذوق کے دلی دوست تھے اور کلامِ ذوق کی حفاظت سے خاص شغف رکھتے تھے۔ ان مآخذ میں کون کون سے اشعار پائے جاتے ہیں ان کی نشاندہی کر دی گئی ہے کلام ذوق اس ترتیب و تدوین سے ہمارے سامنے مختلف حیثیتوں سے اجاگر ہوتا ہے۔

الف۔ وہ حصہ کلام جو اب تک غیر مطبوعہ ہے جس میں ان کا تمام فارسی کلام شامل ہے۔

ب۔ وہ حصہ کلام جو مولانا آزاد کے مرتبہ دیوان میں شامل ہے لیکن بہ قلمِ ذوق اس کا مسودہ نسخہ آزاد سے مختلف ہے علاوہ ازیں اس میں وہ اشعار بھی ہیں جو نسخہ آزاد میں تحریف شدہ حالت میں ہیں یکسر خارج کر دیے گئے ہیں۔

ج۔ وہ تمام غزلیں جو ذوق کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی ہیں اور دوسروں کے نام سے کہی گئی ہیں۔ متن کے بعد حواشی اور اس کے بعد دو ضمیمے دیے گئے ہیں۔

ضمیمہ الف میں نسخہ ویران کا صحت نامہ دیا گیا ہے جو دیگر بہت سے نسخوں میں موجود نہیں اور جسے نسخہ مطبع محمدی کے علاوہ دوسرے نسخوں میں نظر انداز کیا گیا ہے۔ ضمیمہ ب ان تمام تبدیلیوں پر مبنی ہے جو مسودہ دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد میں موجود ہیں۔

د۔ مختلف مآخذ کی نشان دہی کے لیے علامات کا استعمال کیا گیا ہے مثلاً

آب: آبِ حیات، محمد حسین آزاد، طبع اول

آزاد: دیوانِ ذوق، مرتبہ آزاد، طبع اول

اخبار: دہلی اردو اخبار

بلاغت: حقائق البلاغت، مصنف امام بخش صہبائی وغیرہ۔

کلامِ ذوق کے بارے میں اُن کے ہم عصر شعرا نے جو تبصرے اپنے تذکروں میں لکھے یا ان کے بارے میں اس عہد کے اخباروں میں جو شائع ہوا انھیں شامل کیا گیا ہے۔ ذوق کے مکمل سوانحی حالات، آباؤ اجداد، نیز کتنے عرصے تک ذوق شاعری سے وابستہ رہے یہ دورانیہ ابتدائے عمر سے انتہائے عمر تک نصف صدی پر مشتمل ہے۔ ذوق کے مقام و مرتبے کا تعین کیا ہے اور ذوق کے سلسلۂ تلمذ کا بھی تفصیلی ذکر ہے ان کے دوست احباب اور مشاعروں میں شرکت تک کا احوال بہ تفصیل درج ہے کلامِ ذوق کی تدوین نہ ہو سکنے کے اسباب و علل بیان کیے ہیں نیز ذوق نے جن شاگردوں کے دواوین کی اصلاح کی ہے ان کا تذکرہ ہے کہ اگر انھیں بھی شامل کلام ذوق کر لیا جائے تو کلام ذوق سو جلدوں پر مشتمل ہے۔

نسخۂ ویران، نسخہ ذوق کے کل کلام پر مبنی نہیں یہ نسخہ کلام ذوق کا اہم اور مستند مجموعہ ہے یہ جلی قلم کا خط نستعلیق میں خوش خط لکھا ہوا ہے سرورق کی عبارت یہ ہے۔

''ان من البیان شعر :دیوانِ ذوق، در مطبع احمدی طبع شد۔''

نسخہ ویران کی تفصیل کے کتنے صفحات پر غزلیں، قصائد و مثنویاں ہیں۔ مفصل درج ہے۔ ایک اور نسخہ جو تنویر احمد علوی کے پیش نظر رہا ''نگارستان سخن'' ہے اس کی تفصیل مقدمے میں درج کی گئی ہے تعداد علوی مع ردیف درج کی گئی ہے قطعات، غزلیات و رباعیات کی تفصیل بھی فراہم کی گئی ہے اس نسخے کی اشاعت ۱۲۷۹ میں ہوئی تھی۔ اس میں کلام ذوق کا طویل انتخاب شامل ہے۔ یہ اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۷۶ صفحوں پر پھیلا مجموعہ انتخاب ہے۔ مہتمم مطبع کی جانب سے درج کردہ عبارتوں کو بھی لکھا گیا ہے تاکہ معلوم ہوسکے کہ کتنا حصہ کہاں طبع ہوا۔ نسخہ ویران اور نسخہ نگارستانِ سخن میں اولیت کس کو حاصل ہے اس پر دلائل و براہین کے ساتھ بحث کی گئی۔ داخلی و خارجی شواہد پیش کیے گئے ہیں اور ثابت کیا گیا ہے کہ اس کی ترتیب نسخہ ویران سے پہلے عمل میں نہیں آئی نسخہ ویران میں سنہ تو دیا گیا ہے۔ لیکن ماہ و تاریخ کی صراحت موجود نہیں نگارستان سخن میں شامل غزلیں نسخہ ویران میں ضرور شامل ہوتیں اگر وہ پہلے شائع ہوتا اس لیے کہ اس کے مرتب ظہیر دہلوی نسخہ ویران کی ترتیب میں شریک تھے۔

کلام ذوق کی تفصیل جو مذکورہ نسخے میں موجود ہے ردیف وار دی گئی ہے۔ جس کی ترتیب درج ذیل۔

الف۔ ۱۹۶۔ ب ۲۰۔ ج۔ ا۔ ح۔ ا۔ خ۔ ۲۔ د۔ ۳۔

ر۔ ۴۳۔ س۔ ۲۔ ص۔ ۲۔ غ۔ ۴۔ ا۔ ف۔ ۶۔ ق۔ ۲۱۔ اور

ایک مصرعے، ل۔ ۱۲۔ م۔ ۳۱۔ ن۔ ۱۶۔ و ۲۸۔ ۶۰

قصائد، سہرے، قطعات، مسدس اور بند کی تعداد بھی درج کی گئی ہے نسخہ ویران کی اشاعت کے بعد دیگر مطبعوں نے اس کی بنیاد پر دیوانِ ذوق کے دیگر نسخے شائع کیے تھے۔ مگر ان میں کسی قسم کی کمی یا بیشی نہیں کی گئی تھی۔ جو نسخہ مطبع محمدی سے شائع ہوا اس کے سرورق کی عبارت تنویر احمد علوی نے درج کی ہے جو درج ذیل ہے۔

''دریں زماں فرح قراں بعون خالق نہ چرخ کہن

نسخہ دیوان ذوق در مطبع محمدی محمد مرزا خاں بہ

طبع مرصع و ملمع مزین شد''

اس میں سنہ اشاعت کا اندراج غلط ہے۔ ایک اور اہم نسخہ جو مطبع مخزن العلوم غازی آباد کا مطبوعہ ہے ۱۲۸۳ھ میں شائع ہوا ان کے زیر نظر رہی اس کی تفصیل بھی درج ہے ۱۲۸۳ھ میں یہ تیسری بار شائع ہوا تھا، اس کا تحت کے ذیل میں درج کردہ عبارت سے پتا چلتا ہے جسے تنویر احمد علوی نے نقل کیا وہ یہ ہے کہ ''الحمد للہ والمنت کہ دیوان ذوق بار سوم در مطبع مخزن العلوم غازی آباد بہ اہتمام کند دوار کا پرشاد بہ قالب طبع در آمد۔''

مجتس پریس والا نسخہ ان کی نظر سے نہیں گزرا تنویر احمد علوی نے نسخہ ویران و مخزن کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔۔۔ پریس دلی سے ۱۸۸۱ء اور ۱۸۸۷ء سے ذوق کا دیوان شائع ہوا جسے ترتیب و تدوین کے وقت پیش نظر رکھا گیا۔

کتاب کے اختتام پر حواشی ردیف کے اعتبار سے دیے گئے ہیں ۱۹ صفحات پر مشتمل اشاریہ میں شامل کیا گیا ہے جو جلد اوّل پر مبنی ہے اس کے بعد صحت نامہ اغلاط دیا گیا ہے۔

اشاریہ میں درج ذیل ترتیب اپنائی گئی ہے۔

مقدمہ (ا) شخصیات	(حروف تہجی کے اعتبار سے)
ادارے	ایضاً
مقامات	ایضاً
کتب، رسائل، اخبار	ایضاً

دیوان غزلیات:

اسماء و علائم	حروف تہجی کے اعتبار سے
کتب و رسائل	ایضاً
مقامات	ایضاً
لفظیات	ایضاً
ہندی	ایضاً
متفرقات	ایضاً
متروکات	ایضاً

جلد دوم میں غزلیات، قصائد، مثنوی، قطعات و رباعیات کے بعد حصہ سوم میں فارسی کلام شامل ہے بعدازاں حواشی ضمیمہ درج ہے۔ ضمیمہ میں صحت نامہ دیوانِ ذوق بہ تصحیح و مقابلہ شیخ محمد حفیظ شامل کیا گیا ہے۔ مسودۂ دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد، مصادر اور اشاریہ بھی شامل ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس درجہ اہتمام، تلاش جزئیات دقت نظری اور ژارف نگاہی کے ساتھ تنویر احمد علوی نے دیوانِ ذوق تحقیق و تدوین میں کی ہے ایسی سلامت روی کے نمونے نایاب ہیں۔ تحقیق انتقاد کا ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جو اردو زبان و ادب میں یادگار رہے گا۔

رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

دیارِ ماہ

افسر ماہ پوری

صفحات: ۱۱۲۔ قیمت: /۱۵۰ روپے

آر۔۱۳۵، سیکٹر ۵ سی۔۱، نارتھ کراچی

"دیارِ ماہ" کو ان کی برسہابرس کی شاعرانہ مساعی کی تلچھٹ کہہ سکتے ہیں افسر صاحب نے افسانے لکھے تو جلد ہی کلکتہ کی ادبی فضا میں اپنی پہچان کرائی اور شاعری شروع کی تو وہ ڈھاکے کے نمایاں شاعروں میں شمار کیے گئے۔ بنگلہ زبان پر نہایت اچھی دسترس، بعد ازاں کوی نذرالاسلام کی نظموں کا ترجمہ ۱۹۶۳ء میں جام کوثر کے نام سے شائع ہوا ۔۔ دیار ماہ سے پہلے ان کے دو شعری مجموعے 'غبارِ ماہ اور نگار ماہ' ۱۹۹۲ء اور 'طور سے حراتک' (حمد و نعت کا مجموعہ) ۱۹۹۶ء میں شائع ہو کر، قبول عام کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔

افسر صاحب کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے ڈاکٹر حامد ظہیر نے 'طور سے حراتک' 'نعتوں کا مجموعہ اور 'سوکھی پتیاں' کے نام سے افسانوں کا مجموعہ شائع کرایا ہے یہ کام جمیل عظیم آبادی صدر افسر میموریل اکادمی کے تعاون سے جاری ہے۔ دیارِ ماہ اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ دیارِ ماہ میں بچی کھچی غزلیں یکجا ہو گئی ہیں۔

افسر صاحب کی ایک غزل علامہ جمیل مظہری کے اس شعر کی زمین میں لکھی گئی ہے۔

بقدر پیمانہ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

اسی مناسبت سے افسر صاحب کے چند اشعار دیکھیے:

یقیں ہو اس کی وفا پہ کیسے کہ وہ ہے محبوبِ جاں سبھی کا
کبھی کسی کا، کبھی کسی کا، کبھی کسی کا، کبھی کسی کا

ہمیں شرف جو عطا ہوا ہے وہ اس کے احساں کی انتہا ہے
فرشتے اس کے رہیں سلامت، ہمیں تو سودا ہے آدمی کا

افسر صاحب نے میٹرک اوّل درجے میں پاس کیا۔ پھر ملازمت میں آگئے لیکن انگریزی پر ان کی دسترس ایسی تھی کہ حیرانی ہوتی تھی ان کے معاصر واحباب کو، کراچی ریڈیو اسٹیشن میں جب ان کے دوست یونس احمر ٹاک افسر ہوتے تھے۔ تو صبح صبح ریڈیو کے لیے "ٹاک" لکھنا پڑتا تھا۔ افسر صاحب ٹاک لکھتے نہیں تھے فی البدیہہ ٹائپ کرتے تھے ادھر انھیں موضوع دیا گیا، اُدھر ٹائپ رائٹر پر انگلی چل پڑی اور دیکھتے دیکھتے ٹاک تیار! ایسی مہارت میں نے ان کے دوست اختر پیامی میں دیکھی۔ وہ بھی ٹاک لکھتے نہیں ٹائپ کرتے تھے۔

افسر صاحب سہ لسان تھے اپنے دوست یونس احمر کی طرح اردو بنگلہ اور انگریزی تینوں زبانوں پر یکساں دسترس رکھتے تھے۔

کلکتہ اور ڈھاکے میں مجھے ایک شخص ایسا نہ ملا جو افسر صاحب کا شاکی نظر آیا ہو، وہ سب کے دلدار تھے اور سب ان کا یکساں احترام کرتے رہے۔ ان کے اس وصف نے کتنوں کو اپنا گرویدہ بنایا انھیں میں ایک میں بھی ہوں۔

افسر صاحب سے یہ تعلق کراچی میں گھریلو سطح پر قائم یوں ہوا کہ افسر صاحب کو کرائے کے اپارٹمنٹ کی ضرورت ہوئی۔ اتفاق سے ناظم آباد کے جس گھر کے گراؤنڈ فلور پر میں رہتا تھا اس کا دوسرا ملحقہ حصہ خالی تھا۔ میں نے فوراً افسر صاحب کو اطلاع دی انھوں نے آکر دیکھا۔ پسند آیا اور اہل خانہ کے ساتھ آگئے۔ اور دو تین برس تک رات دن کا ساتھ رہا۔ افسر صاحب سادہ طبع اور سادہ وضع تھے۔

کتاب قابلِ مطالعہ ہے۔

(ا۔س)

تلاش اقبال

ڈاکٹر محمد علی صدیقی
صفحات: ۲۱۰۔ قیمت: /؟؟؟روپے
پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی

گزشتہ چند برسوں سے ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی تنقید نے ایک نیا موڑ کاٹا ہے۔ شخصیت کے تقابل اور حوالے سے تنقید کے امکانات کی جستجو کرنا شروع کیا۔ اس کے لیے وہ مقامی و عالمی شخصیات کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان کے گرد تنقید کے تانے بانے بنتے ہیں۔ اس بنت کاری میں اقبال کے تقابل میں کسی عہد ساز شخصیت کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ یوں مخاطب کے عیاں اور مخفی جوہر اجاگر ہو کر قارئیں کے سامنے آجاتے ہیں۔ ڈاکٹر صدیقی نے اپنے اس کام کی ابتدا سر سید احمد خاں سے کی ہے۔ کتاب 'تلاش اقبال' کے تمام ابواب اسی نہج سے قلم بند ہوئے ہیں۔

'تلاش اقبال' کا چھٹا باب 'اقبال اور حلاج' کے عنوان پر ہے۔ اس میں ڈاکٹر صدیقی نے مستشرق این میری شمل کے حوالے سے بتایا ہے کہ "وہی اقبال جو اپنی تصنیف "فارسی میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا (۱۹۰۵ء) میں حلاج سے برہم نظر آتے ہیں اور ان علمائے کرام کے ہم خیال ہیں جو اسے زندیق، شعبدہ باز اور ملحد قرار دیتے ہیں۔ پھر جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) میں اقبال یکسر مختلف موقف اختیار

کر لیتے ہیں۔ ''آخر کیوں؟'' اس بارے میں ڈاکٹر صدیقی کا خیال ہے کہ علامہ کی اس تبدیلی فکر و نظر کا محرک مولانا اشرف علی تھانوی کا وہ 'نامہ' (جو غیر مطبوعہ ہے) ہے جس میں مولانا نے حسین بن منصور حلاج کی وکالت کی ہے۔ اسی مضمون میں بر سبیل تذکرہ R-A Nicholson کا نام بھی آیا ہے جس کی تصنیف "Idea of Personality in Islamic Mystycism" فلسفہ حلاج کا اثبات کرتی ہے۔

قرین قیاس ہے کہ علامہ اقبال کے خیالات میں جو تبدیلی آئی ہے وہ اس ملاقات کا ثمرہ ہے جو علامہ اقبال اور فرانسیسی مستشرق لوئی ماسی نیوں کے درمیان ان کے یورپ کے قیام میں ہوئی۔ یہ زمانہ جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) کی اشاعت سے برسوں پہلے کا ہے۔ ۱۹۰۷ء میں ماسی نیوں نے حسین بن منصور حلاج کو اپنا موضوعِ تحقیق بنایا تھا ۸-۱۹۰۷ء وہ زمانہ ہے جب علامہ یورپ میں قیام کرتے تھے۔

فرانسیسی مستشرق لوئی ماسی نیوں مئی ۱۹۲۲ء میں حلاج پر ڈاکٹریٹ کے دو مقالات پیش کر چکے تھے۔ ڈاکٹر صابر آفاقی نے ڈاکٹریٹ کے ایک مقالہ ''قوس زندگی حسین بن منصور حلاج'' کا اردو ترجمہ فارسی متن کے حوالے گیا جو ۱۹۷۵ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس مترجم کتاب کی عبارات سے پتا چلتا ہے کہ ماسی نیوں، حلاج کا سچا عاشق تھا اور زندگی کے پچپن برس، کوائف حلاج کی تلاش و تجسس میں گزارے۔ حلاج کے اس عاشق صادق نے برصغیر پاک و ہند کے مختلف مقامات کا سفر کیا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ حسین بن منصور حلاج برصغیر پاک و ہند کے مختلف مقامات سے ہوتا ہوا گزرا ہے۔ گزرگاہ کی حیثیت سے سندھ... ملتان وغیرہ کا تاریخ میں بھی ذکر موجود ہے۔

ماسی نیون نے اپنی کتاب ''قوس زندگی حسین بن منصور حلاج'' میں یہ اطلاعات فراہم کی ہیں کہ اوّل اوّل حلاج کا نظریۂ وحدت الوجود، شیخ محی الدین ابن عربی (م ۶۳۸ھ) نے اپنایا۔ اور نہ صرف اپنایا بلکہ اس کے مبلغ و شارح ہوئے۔ اور پھر ابن عربی کے شاگرد صدر الدین قونوی سے ہوتا ہوا ان کے شاگرد مولانا رومی تک پہنچا۔ شدہ شدہ اس سلسلے کی امام ابو حامد غزالی طوسی (۵۰۵ھ) حکیم سنائی (۵۲۵ھ) شہاب الدین سہروردی شہید (۵۸۵ھ) اور فرید الدین عطار (۵۸۹ھ) تک رسائی ہوئی۔

حلاج کے اس وحدت الوجودی نظریے کی پذیرائی کے ضمن میں برصغیر پاک و ہند کے صوفیا میں ''قطب الدین بختیار کاکیؒ، فرید الدین گنج شکرؒ، نظام الدین اولیاؒ، نصیر الدین چراغ دہلوی، شیخ سلیم چشتی اور علما میں شیخ عبدالحق دہلوی، اور شاہ رفیع الدین اور اردو شعرا میں میر، درد، غالب اور اقبال کے نام نامی آتے ہیں۔ سب کے سب نظریہ وحدت الوجود کے قائل تھے۔

برصغیر پاک و ہند، عرب اور سنٹرل ایشیا کے ممالک میں منصور حلاج کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ''بغداد کے مکتبِ شہودیہ کے علاء الدین سمنانی (م-۷۳۶ھ) دہلی میں مخدوم جہانیاں جہاں گشت (م-۷۸۵ھ) عظیم آباد (پٹنہ) میں عبدالقادر بیدل (م-۱۱۳۳ھ) سرہند میں مجدد الف ثانی (م-۱۰۳۴ھ) جیسے عظیم صوفیا، علما اور شاعر حسین بن منصور حلاج کے مداح و معترف تھے۔'' علاوہ ازیں حلاج کے نام میں مختلف مقامات پر خانقاہیں قائم ہوئیں۔ جن میں اوش (قرغستان) غدف (موری تانیا) روتا، اور شورش وارہ (ضلع فرید پور) بنگلہ دیش میں ہیں۔ بنگال میں سلطان حسین شاہ کے زمانے سے خانقاہیں قائم ہیں اس

مسلک اصفیہ کے مرشد "سچا پیر" کہے جاتے ہیں، سندھ میں سچل سرمست، حلاج بن منصور ثانی کہے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی زیر بحث کتاب "تلاش اقبال" میں شامل بیشتر مضامین اقبال سے متعلق ہیں۔ اس میں جن دوسری اہم اور زمانہ ساز شخصیات پر باتیں ہوئیں ان سے اقبال کی فکری و نظری تعلیمات کے کچھ اور گوشے ظاہر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صدیقی کی یہ علمی وادبی مساعی، تفہیمات اقبال، رومی، قرۃ العین طاہرہ اور غالب میں اُن کے تازہ رُخ سے آشنا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر صدیقی کی ان تحاریر میں غور و خوص کے جذبے کو اہمیت دی گئی ہے اور استدراک و ادراک کو کھلا رکھا گیا ہے۔ تاکہ آنے والی نسل پر غائر مطالعے کی حقیقت واضح ہو، اور وہ بھی اشیا اور موضوعات پر نظر ڈالنے میں کھلے ڈلے رویہ اختیار کریں، فراخ دلی کو شعار بنائیں اور اختلاف فکر پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے قابل بن سکیں۔

"ماسی نیون کی تصنیف "قوس زندگی حسین بن منصور حلاج" صفحہ ۴۱ پر ابن سبعین مرسی (۶۶۹ھ) یہ خبر دیتے ہیں کہ "مفکرین اسلام نے اس طرف توجہ کی کہ حسین بن حلاج عالم گیر دین کا پیرو تھا۔ اور ان کا خیال ہے کہ وہی قطبِ معنوی ہے جو اسلام کو آخری وحدت کی طرف لیے جارہا ہے۔ جب اسلام کے فقہی اختلافات مٹ جائیں گے، لوگ خود ساختہ رسوم و رواج کو خیر باد کہہ کر نسل انسانی کو گلے لگائیں گے تو خدا کی توحید بنی نوع انسان کی توحید بن جائے گی۔ اور ما و من کی تفریق مٹ جائے گی۔"

ابن سبعین مرسی کی باتوں کا لب لباب یہ ہے کہ فکرِ حلاج ایک ایسے عالم گیر دین کا داعی تھا جب خدا کی توحید بنی نوع انسان کی توحید بن جائے گی۔ دیکھا جائے تو حلاج انسابی فوقیت پر انسانی فوقیت کو مقدم جانتا تھا۔

یہاں انسان کی دلداری کے حوالے سے مجھے بلخ کے حضرت ابو بن ادھم کا فلسفہ انسان دوستی اور کسی بڑے فارسی شاعر کا یہ مصرع یاد آیا جاتا ہے:

دل بدست آور کہ حج اکبر است

کتاب اچھی چھپی ہے، قابل داد و مطالعہ ہے۔

(ا۔س)

خانوادۂ نبویؐ و عہدِ بنی اُمیہ
حقائق و اوہام

ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی

صفحات: ۲۵۰۔ قیمت: /۲۰۰ روپے

العربی ادارۂ تصنیف و نشر، کراچی

"خانوادۂ نبویؐ و عہدِ بنی امیہ — حقائق و اوہام" کے مندرجات جستہ جستہ مقالے کی شکل میں کراچی کے ایک موقر ہفتہ وار

میں تیرہ سال قبل شائع ہو چکے ہیں ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

"کتاب میں جو موضوعات زیر بحث آئے ہیں ان کا اندازہ کتاب کے عنوان سے نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اتنے مختلف تاریخی، علمی، انسابی موضوعات ہیں کہ ان کے لیے ایک جامع عنوان اختیار کرنا ممکن نہ تھا..."

ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی نے خانوادۂ نبویؐ اور عہدِ بنی امیہ کے ادوار کا جس تفصیل سے ذکر کیا ہے اسے انگریزی کی اصطلاح میں Microscopic کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے جس لب و لہجے میں ان ادوار کے وقوع اور مسائل و معاملات کو معرض بحث میں لایا ہے اس کے لیے لفظ "متوازن" بہت موزوں ہے۔ انھوں نے اپنے منہاجِ فکر سے امتِ مسلمہ کی نئی نسل کو چودہ سو سالہ ملّی تاریخ سے باخبر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ افرادِ ملت کے اندر حقائق کو برداشت کرنے کے جذبے کو ابھارا ہے اور وہ اوہام و فروعات جو بہ مرورِ زمانہ ہماری تاریخ میں در آتے رہے ہیں۔ انھیں نظر میں رکھنے اور ان سے محترز رہنے کی تلقین کی ہے فی زمانہ حقیقت حال کو دودھ کا دودھ پانی کا پانی کے مصداق پیش کرنے والی کتب کم کم ہیں۔ اس نوع کی اور بھی کتب شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر ندوی برسہابرس سے یہ کام سرانجام دیتے چلے آرہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر سے نوازے۔

ڈاکٹر ندوی نے جس انداز میں ملّی تاریخ کے سیاق و سباق پر نظر ڈالی ہے وہ قارئین پر اپنی تمام تر جزئیات و مبادیات کے ساتھ آئینہ ہو جاتا ہے۔ یہاں مجھے اردو کے معروف شاعر و نقاد پروفیسر نجم الہدیٰ کے والد بزرگوار جناب سید محمد مجتبیٰ کی یہ باتیں یاد آئی جارہی ہیں۔ وہ عالم آدمی تھے، اسلامیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے ایسے ہی موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے ایک موقع پر کہا تھا۔ بنی امیہ کا آخری دور اور بنی عباس کے تمام تر ادوار میں شاید ہی کوئی خلیفہ ایسا ہو جسے طبعی موت نصیب ہوئی ہو، ورنہ سب کے سب سازش، سیاسی مناقشے اور حرصِ جاہ کے نتیجے میں فنا کے گھاٹ اُتارے گئے۔ مجتبیٰ صاحب کے اس اخذِ نتیجہ کی بہت حد تک ڈاکٹر ندوی کی کتابِ زیرِ بحث میں مندرج حقائق سے تصدیق ہو جاتی ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ملت اسلامیہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کا دور بہ دور جائزہ لیا جائے اس کے مثبت پہلو کی تشہیر کی جائے اور منفی پہلو پر دیانتدارانہ اور منصفانہ نگاہ ڈالی جائے ساتھ ہی احوال معاشرہ کی اصلاح کے لیے نہ صرف دوسروں کے بلکہ اپنے گریباں میں بھی وقتاً فوقتاً جھانکتے رہنا چاہیے کہ یہی خود تنقیدی عمل کی راہ کھولتی ہے۔

میرے نزدیک ملت اسلامیہ کے مسائل و معاملات کے سلسلے میں ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی کی زیرِ بحث کتاب بند مکان میں کھڑکی کھولنے کے مترادف ہے۔ اس تصنیف کا یہی ماحصل اور کارنامہ ہے۔

کتاب قابل مطالعہ ہے العربی ادارۂ تصنیف و نشر نے نہایت سلیقے سے شائع کی ہے۔

(ا۔س)

رنگِ شناسائی

احمد زین الدین

صفحات: ۲۰۸۔ قیمت: ۲۲۵/ روپے

اے-۸، ندیم کارنر بلاک 'این' نارتھ ناظم آباد، کراچی

احمد زین الدین کی تحریر کا افسانہ نگاری سے مضمون نگاری تک بنیادی رنگ ایک ہے۔ لیکن ''رنگِ شناسائی'' انیک (بہت سے) رنگوں کی مظہر بن گئی ہے۔ یہ اس لیے ممکن ہوا کہ اس میں بہت سی قابلِ ذکر شخصیات معرضِ بحث میں آتی ہیں۔ ہر شخصیت ایک انفرادیت کی حامل ہوتی ہے۔ اور ہر انفرادیت کا اپنا جداگانہ رنگ ہوتا ہے۔ پھر شخصیات کے الگ الگ رنگ کے ساتھ لکھنے والے کی سوچ سمجھ کا رنگ شامل ہو کر ہر تحریر کو دو آتشہ بنا گیا ہے۔

کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے اپنے پیرایۂ خاص میں لکھا ہے' انھوں نے بعض مضامین کے لیے خاکے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور ان پر خاکے کی کئی خصوصیات کے حوالے سے باتیں کی ہیں۔ دراصل خاکے اور شخصیت نگاری میں موہوم سا فرق دیکھا جاتا ہے۔ دونوں کا محوری نقطہ کوئی نہ کوئی فرد ہوتا ہے۔

ڈاکٹر کشفی نے بنگلہ دیش کے اہم افسانہ نگار غلام محمد پر لکھے گئے مضمون کو مکمل خاکہ کہا ہے، بلکہ اس خاکے میں غلام محمد اور احمد زین الدین کے تعلقات کے حوالے سے خود زین الدین کی زندگی کا ایک باب رقم ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر کشفی افکار کے مدیر صہبا لکھنوی کے خاکے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''صہبا لکھنوی کا خاکہ جزیاتِ نگاری، انسان شناسی، ماحول اور فضائی عکاسی، ادب سے صہبا کے لگاؤ کا بے نظیر مرقع ہے۔ اس لگاؤ کو غلاظت' ماحول کی گندگی، دوستوں کا سلوک اور خون پینے والے پسو بھی کم نہ کر سکے۔''

ڈاکٹر کشفی نے ڈاکٹر حنیف فوق پر لکھے گئے مضمون ''فوق صاحب یادوں کے آئینے میں' کو ''رنگِ شناسائی' کا وہ واحد مضمون کہا ہے جو ''خوف احترام'' سے عبارت ہے، ڈاکٹر صاحب کتاب کے مندرجات پر مزے مزے میں باتیں کرتے ہوئے بہت سے لوگوں کو معرضِ ذکر میں لے آئے ہیں۔ اس محفل میں نظیر صدیقی، اختر لکھنوی، نجم الحسن، علی حیدر ملک، غلام الثقلین نقوی، شاہد کامرانی، علقمہ شبلی اور ڈاکٹر ظفر اوگانوی دیکھے جاتے ہیں۔

'فوق صاحب یادوں کے آئینے میں' احمد زین الدین نے اپنے خاص الخاص استاد کا خوب حق ادا کیا ہے۔ فوق صاحب اس سے بھی زیادہ کے مستحق ہیں۔ اصل میں فوق صاحب جس دور میں بسر کر رہے ہیں۔ وہ جتنا ہے اس سے کہیں زیادہ خود کو دکھانے کا دور ہے اور فوق صاحب کا وتیرہ یہ رہا ہے کہ وہ جتنا ہیں اس سے کہیں کم خود کو دکھاتے ہیں۔

بہر حال فوق صاحب کو صاحبانِ نظر نے کس طرح دیکھا ہے۔ اس کی مثالیں تو بہت ہیں۔ صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے، جو ڈاکٹر احسن فاروقی کی رقم کردہ ہے:

> "فوق صاحب عام نقادوں سے بہت ہی زیادہ اونچے مرتبے پر پہنچے ہوئے ہیں۔ وہ فطر تاً بت شکن ہیں۔ قدرت نے انھیں غیر معمولی ذہانت بخشی ہے انھوں نے ریاضت کی ہے اور نہایت خلوص سے علم حاصل کیا ہے۔ ان کے کردار میں اتنا زور ہے کہ باطل سے نہ دبیں اور اپنی پوری ہمت سے کام لے کر حق کو منوائیں، ذہانت، علم، جسارت، یہ تینوں صفتیں جو کسی نقاد کے لیے بڑی ضروری ہیں فوق کے مضامین میں پورے طور پر موجود ہیں۔

کتاب میں شامل تمام شخصیات، اسی محبت اور اعتراف کے ساتھ زیرِ بحث آئے ہیں۔ احمد زین الدین کا مزاج خوش خُلقی سے عبارت ہے۔ اس نے سب کو اچھا دیکھا ہے۔ جب آدمی خود اچھا ہو تو اس کو ہر فرد میں اچھائی نظر آتی ہے "رنگِ شناسائی" اس جلوے کی حقیقی مظہر ہے۔

کتاب کا انتساب نامور مصور بشیر موجد کے نام کیا گیا ہے۔ "رنگ شناسائی" ادارہ زین پبلی کیشنز سے صاف ستھری اور دیدہ زیب چھپی ہے۔

(ا۔ س)

داغ جگر اور شعلہ طور ایک تقابلی جائزہ

ڈاکٹر احمر رفاعی

صفحات: ۳۵۴۔ قیمت: /۲۵۰ روپے

جادواں پبلی کیشنز، کراچی

ڈاکٹر احمر رفاعی کا جگر مراد آبادی پر بہ تکرار ادبی کام کیے جانا اہل نظر میں مثالی ٹھہرتا ہے، اور اب تو احمر رفاعی صاحب اور جگر صاحب لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ بلکہ اس جذبے کے اظہار کے لیے طلوعِ افکار کے مدیر حسین انجم نے اپنے مضمون کا عنوان "حرفِ آخر" لگایا ہے۔

ڈاکٹر رفاعی صاحب کو جگر کے کلام سے ۱۹۱۹ء میں رغبت و قربت ہوئی۔ یہ شوق پروان چڑھتا ہوا ۱۹۶۹ء میں کمال کو پہنچا جب انھوں نے 'جگر مراد آبادی آثار و افکار' کے عنوان سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صدر شعبہ اردو سندھ یونی ورسٹی کے زیر نگرانی پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ ۱۹۷۶ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان نے اس مقالے کو کتابی صورت میں شائع کیا۔

جگر صاحب کا پہلا مجموعہ بہ نام ''داغ جگر'' ۲۲-۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ اس کے مرتب احسان احمد ایڈوکیٹ تھے۔ ڈاکٹر رفاعی کی اطلاع کے مطابق اس وقت جگر صاحب کی عمر ۳۲ سال تھی۔

'شعلۂ طور'' وہ شعری مجموعۂ کلام ہے جس سے جگر صاحب کو دوام حاصل ہوا اور ہر طرف شائقین ادب میں جگر ہی جگر نظر آنے لگے اور زبان زدِ خلائق ہوئے۔

زیر تبصرہ کتاب انھیں دو کتابوں 'داغ جگر' اور 'شعلۂ طور' کا ایک تقابلی جائزہ ہے۔ لیکن اس کے مندرجات میں اور بہت کچھ ہیں جو متفرقات کے ذیل میں آتے ہیں یہ متفرقات قارئین کے لیے اپنے دامن میں گل ہائے رنگ رنگ رکھتے ہیں۔

کتاب کے آغاز میں سعدی شیرازی کی فارسی حمد ہے اور ہندی نعت ''جگ کی شوبھا- جگت سنگھار'' خود ڈاکٹر رفاعی نے لکھی ہے۔ اس نعت کو مطلع اول، مطلع ثانی اور مطلع ثالث کے ذیلی عنوانات دیے گئے ہیں۔ اول و ثانی میں چھ چھ شعر ہیں اور ثالث میں پانچ شعر۔ اس طرح کل ملا کر اس نعت میں سترہ اشعار ہیں۔ اس کی زبان ہندی ہے اور نعت بہت جذبے سے لکھی گئی ہے، ہندی زبان پر ڈاکٹر رفاعی کی دسترس کا پتا دیتی ہے اور قاری کو نعت کے باب میں ایک نئے ذائقے سے روشناس کراتی ہے۔ اس نعت کو پڑھتے ہوئے محسن کاکوروی کا وہ نعتیہ قصیدہ بہت یاد آیا جس کا عنوان ہے 'قصیدہ مدیح خیر المرسلینؐ' جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

سمتِ کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

اس کتاب میں جگر صاحب کے حوالے سے بہت سی چیزیں یکجا ہو گئی ہیں۔ شدہ شدہ اس کتاب کا متن کلام و احوال جگر کے باب میں انسائیکلوپیڈک ہو گیا ہے۔

جگر صاحب کی تصاویر اور خود صاحب کتاب کی مختلف زمانے کی تصاویر ایک البم کا منظر پیش کر رہی ہیں۔ ۱۹۱۹ء سے جگر صاحب، ان کے کلام، اور ان کے احوالِ حیات سے جو ڈاکٹر احمر رفاعی کی رفاقت ہوئی ہے وہ اُسی شد مد سے اب تک قائم ہے۔ یہ بڑی بات ہے اور بڑی بات ہر فرد و بشر کے بس کی بات نہیں۔

کتاب اچھی چھاپی گئی ہے صوری و معنوی حُسن سے مرصع ہے۔

(ا۔س)

برائے مہربانی مضمون صفحے کے ایک طرف صاف اور خوشخط لکھیں

گردوپیش

اردو کے بزرگ ترین شاعر تابش دہلوی کی یاد میں تعزیتی جلسہ

۲/اکتوبر ۲۰۰۴ء کو انجمن ترقی اردو پاکستان کے دفتر واقع ڈی ۱۵۹ ،بلاک ۷ گلشنِ اقبال، یونی ورسٹی روڈ میں اردو کے بزرگ ترین شاعر جناب تابش دہلوی کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔

انجمن کی روایت کے مطابق صدارت صدر انجمن کو کرنا تھی وہ بہ وجوہ شریک نہ ہوسکے، ان کی عدم موجودگی میں یہ ذمے داری عموماً انجمن کے معتمد اعزازی کو سنبھالنا پڑتی ہے۔ لیکن معتمد اعزازی جناب جمیل الدین عالی نے جلسے میں، موجود جناب مسلم شمیم کے لیے صدارت کی تجویز کی، اور جناب امراؤ طارق جو جلسے کی نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے جناب مسلم شمیم کو جناب تابش دہلوی کے سلسلے میں منعقد کیے جانے والے جلسے کی صدارت سونپ دی۔

تعزیتی جلسے کے انعقاد کا آغاز یہ جناب امراؤ طارق نے پڑھ کر سنایا انھوں نے کہا، جناب تابش پاکستان میں ہجرت کر کے آئے تو اپنے دل میں دلی بسالائے انھوں نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری، جناب احمد ندیم قاسمی اور جناب سلیم احمد کے تاثرات پڑھ کر سنائے جو ان حضرات نے مختلف مواقع پر حضرت تابش کے لیے کہتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا خیال ہے کہ جو چیز تابش دہلوی کی شاعری کو دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے وہ دہلویت کا پاس ہے۔

جناب احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں، ”حضرت تابش دہلوی نے اس زمانے میں نام پیدا کیا جب فانی، فراق، یگانہ، اصغر، جگر اور حسرت کی غزلوں سے پورا برصغیر گونج رہا تھا۔“

سلیم احمد نے کہا، ”تابش صاحب میں ایک ایسا ارتکاز اور صحت پائی جاتی ہے جو اس زمانے میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔“

جناب امراؤ طارق نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے جناب جمیل الدین عالی سے استدعا کی وہ تابش صاحب کے متعلق اظہار خیال کریں۔

جناب جمیل الدین عالی نے بجائے تقریر کے گفتگو کا انداز اختیار کیا اور جستہ جستہ تابش صاحب کے فن و شخصیت کے حوالے سے اتنی ساری باتیں کہہ ڈالیں، جو کم کم ہی سننے میں آئیں۔ انھوں نے کہا، اُس دور میں جب کہ شعر و شاعری کے دریا میں اتنی بہت سی لہریں ٹکرا رہی تھیں تابش صاحب کے لیے عام ڈگر سے خود کو الگ تھلگ ظاہر کرنا اور اپنا رنگ نکالنا آسان نہ تھا، عالی

صاحب نے کہا تابش بھائی کو فانی کا ترنم پسند تھا۔ فانی سے وہ اتنے قریب تھے کہ بعض اوقات ان کے اشعار اور فانی کے اشعار میں تمیز مشکل ہو جاتی تھی۔ انھوں نے بحیثیت مجموعی تابش صاحب کے فن کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ ان میں میر و غالب اور بہادر شاہ ظفر تک کی شعری روایت کو محسوس کیا جاسکتا ہے، در حقیقت وہ بیسویں صدی میں انیسویں صدی کی روایت کے آدمی تھے۔

عالی صاحب نے کہا دہلی میں ایک دور بیخود دہلوی اور ان کے ہم پلہ معاصر استادوں کا تھا، جن کے آگے کسی نئے شاعر کے کلام پر اسے نگاہ اٹھا کے دیکھ لیا جاتا تو استادوں کی اتنی سی التفات بھی ہزاروں لوگوں کی تعریف کے برابر سمجھی جاتی تھی، تابش صاحب ان کے مشاعرے میں اپنا کلام سنا کر سر خرو ہوئے اور توصیف کے مستحق ٹھہرے۔ عالی صاحب نے اسی دور میں بڑے پتے کی بات کہہ دی کہ غزل میں جدید دلّی اسکول تابش دہلوی سے ابھرا۔ کلاسیکی پس منظر رکھنے کے باوجود تابش بھائی، فیض، راشد اور دیگر معاصرین میں جدید غزل گو متصور ہوتے تھے۔

آخر میں عالی صاحب نے کہا کہ ایسا نہیں تھا کہ بھائی تابش کے مزاج میں کھردرا پن تھا، نہایت سادہ طبیعت پائی تھی۔ ہم جیسے لوگ معاصر ہونے کے باوجود نیاز مند بلکہ ایک خوف کھانے والے نیاز مند کی حیثیت سے رہے، آخری بات یہ کہ وہ دہلی روایت کے مضبوط اور گہرے فرد تھے۔

صدر جلسہ جناب مسلم شمیم نے کہا، "عالی صاحب بہت اچھے اور سہل موڈ میں تابش صاحب کے صاحبزادے سعود تابش اور بیٹی شاہانہ تابش سے مخاطب رہے، تابش کے علاوہ اس عہد کے بارے میں بہت سی باتیں ہوئیں، میں عالی صاحب کے عین بازو میں بیٹھا ہوا یہ گفتگو سن رہا تھا مجھے تو ایسا لگا کہ پوری آٹھ دہائیاں اس میں سمٹ آئی ہیں۔ عالی صاحب کی گفتگو نے اس اجلاس کو تابش صاحب کے ایک ریفرنس میں بدل دیا ہے۔

جناب صدر نے کہا کہ گزشتہ ۳۰ برس سے ہماری قربت بھی تابش صاحب سے مشاعرے اور دیگر ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے رہی ہے۔ اس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ تابش صاحب ایک Perfection کے آدمی تھے وہ مشاعرے میں آخری عمر تک جسمانی و ذہنی اعتبار سے الرٹ ہوتے تھے۔ صدر تقریب جناب مسلم شمیم نے کہا کہ حضرت تابش اپنے عہد کے اہم کلاسیکی شاعر تھے۔ شاعری ان کا اگرچہ سب سے بڑا حوالہ ہے لیکن ان کی نثر بھی کچھ کم نہ تھی۔ ان کی تصنیف "دید و باز دید" اس کا ایک اچھا حوالہ ہے۔ عام فہم جملوں میں گہری باتیں کہہ جاتے تھے اس طرح کی عبارت رقم کرنا گہری نظر رکھے بغیر ممکن نہیں کراچی کا منظر نامہ ان کے چلے جانے سے اداس ہے۔

صدر کے خطاب کے بعد جناب امراؤ طارق نائب معتمد اعزازی انجمن نے تعزیتی جلسے کے اختتام کا اعلان کیا اور حاضرین کی تواضع چائے اور ناشتہ سے کی گئی۔

(رپورٹ: ادارہ)

حبیب صدیقی کے اعزاز میں الوداعی نشست

جدہ میں مقیم نظم کے معروف شاعر حبیب صدیقی نے بسلسلۂ روزگار جدے سے دمام نقل مکانی کا ارادہ کیا تو ادارۂ سحاب نے ان کے اعزاز میں ایک الوداعی محفل کا اہتمام کیا۔ محفل کی نظامت ادارۂ سحاب کے بانی اور مدیرِ اعلیٰ نسیم سحر نے کی جب کہ صاحب صدر اور مہمانانِ خصوصی کے طور پر جناب حبیب صدیقی مسند افروز ہوئے۔ مدینہ منورہ سے آئے ہوئے سینئر شاعر سید نعیم حامد علی الحامد کو بھی مہمانِ اعزازی کے طور پر مدعو کیا گیا۔ صاحبِ خانہ اور میزبان جناب نسیم سحر کے ابتدائی خیر مقدمی کلمات سے تقریب کی کارروائی کا آغاز کیا گیا۔ آیاتِ کلامِ ربانی کی تلاوت محمد مختار علی نے کی جب کہ معروف شاعر محسن علوی نے جو اسی شام مدینہ منورہ سے لوٹے تھے مدینہ منورہ میں کہی ہوئی اپنی تازہ ترین نعت پیش کی۔ اس مشاعرے میں زیادہ تر شعرائے کرام نے اپنی غزل یا نظم پیش کرنے سے پہلے حبیب صدیقی کو بھی منظوم خراجِ تحسین پیش کیا اور حالاتِ حاضرہ اور امتِ مسلمہ کی صورتِ حال پر ان کے منفرد اسلوب میں تخلیق کردہ نظموں کی تعریف کی۔ جناب حبیب صدیقی سے وقفے وقفے سے ان کی متعدد نظمیں سماعت کی گئیں۔ جن شعرا نے اس محفل میں اپنا کلام پیش کیا ان میں محمد اسد خان، زمرد خان سیفی، عبدالقیوم خان واثق، محمد مختار علی، محسن علوی، قمر حیدر قمر، نعیم بازید پوری، نسیم سحر، نورین طلعت عروبہ، شمع ظفر مہدی، سید مظہر مہدی، حبیب صدیقی اور سید نعیم حامد علی الحامد شامل تھے۔

اس موقع پر ادارۂ سحاب کی جانب سے جناب حبیب صدیقی کو کتب اور دیگر یادگاری تحائف بھی پیش کیے گئے آخر میں جناب حبیب صدیقی نے اپنی چند مقبول نظمیں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی اظہار خیال کیا اور جدہ کے ادبی حلقوں کی جانب سے اتنی پذیرائی اور خلوص ملنے پر تشکر کے کلمات کہے۔ محفل کا اختتام پر تکلف عشائیے پر ہوا۔

(رپورٹ: محمد اسد خان، جدہ)

حلقۂ آہنگ نو کی ماہانہ تنقیدی نشست

گزشتہ روز حلقہ آہنگ نو کی ماہانہ تنقیدی نشست سمن آباد میں منعقد ہوئی صدارت رؤف نیازی اور نظامت راقم الحروف نے کی۔ احمد زین نے (استوارٹ کلوائٹ) کی انگریزی کہانی کا ترجمہ "اسپرنگ بلوم کا شوہر" کے عنوان سے پیش کیا، رحمت اللہ جری نے کہا کہ ترجمہ کے بجائے اپنی تخلیقی کہانی پیش کرتے تو فکری و فنی بصیرت کا بہتر اظہار ہوتا۔ شارق بلیادی نے کہا کہ اصل مصنف کی کہانی کے بجائے محض ترجمہ پر اظہار خیال مناسب ہوگا۔ اس ضمن میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ترجمہ اچھے پیرائے میں کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زاہد حسین نے کہا کہ کہانی میں اصل کردار تو مشرق بعید کے گھریلو خواتین کے ساتھ پیش آنے والے جنسی عوامل کی ترجمانی ہے جو لمحۂ فکریہ ہے شاعر صدیقی نے کہا کہ کہانی کے کرداروں کے نام تبدیل کردیے جائیں تو ہمارے اپنے معاشرے کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ پروفیسر شبنم صدیقی نے قرۃ العین حیدر کا افسانہ "کہر کے پیچھے" کے تناظر میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ افسانوی تکنیک کے اعتبار سے ترجمہ اچھا ہے۔ فرائڈ کے نظریے کے مطابق ایک تخلیق کار اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر ایسی کہانیوں سے لطف اندوز

ہوتا ہے، شفیق احمد شفیق نے بھی ترجمے کی افادیت اور عالمی سطح پر جدید موضوعاتی کہانیوں سے آگاہی اور مطالعے پر زور دیا اور ترجمہ کار کی تعریف کی۔ سلیم عکاس نے ترجمہ نگاری کی تعریف میں کہا کہ ان دنوں اچھی کہانیوں کے ترجمہ کا رجحان معدوم ہو چلا ہے اس اعتبار سے ترجمہ کار کی کاوش قابلِ ستائش ہے۔ احمد سعید فیض آبادی، فرقان ادریس، خورشید عالم، مطیع الرحمٰن عارف، ریحان کراچوی اور نازش شفیق نے مجموعی اعتبار سے کہانی پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

صدرِ نشست رؤف نیازی نے صدارتی خطاب میں کہا کہ ترجمہ نگاری دوبارہ اُگلے ہوئے نوالے کی صورت ہے۔ مگر اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ آج اردو ادب پر فکشن کے اعتبار سے دیگر زبانوں کے تراجم کا فیضان ہے۔ زیر تنقید کہانی میں جنسی و جمالیاتی پہلو کو فنی پختگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ صاحبِ صدر رؤف نیازی نے اراکین حلقہ آہنگ نو کو سالہا سال سے ہر ماہ تنقیدی نشستیں منعقد کرنے پر مبارک باد پیش کی۔ قبل ازیں اردو کے ممتاز صاحب طرز شاعر و ادیب ڈاکٹر فہیم اعظمی مدیر (صریر) جگن ناتھ آزاد اور سحاب قزلباش کی گرانقدر ادبی خدمات پر خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

(رپورٹ: احمد سعید فیض آبادی)

حنیف ترین کے مجموعے 'ابابیلیں نہیں آئیں' کی رسمِ اجراء

گزشتہ دنوں جموں اینڈ کشمیر اکاڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگوجیز کے صدر دفتر واقع لال منڈی سرینگر میں، عالمی شہرت یافتہ اردو شاعر اور دانشور ڈاکٹر حنیف ترین کے ساتھ ایک ملاقات کا اہتمام کیا گیا، جس کے دوران ترین صاحب کے تازہ شعری مجموعے ''ابابیلیں نہیں آئیں'' کی رونمائی انجام دی گئی۔ تقریب میں وادی کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے ادیبوں، شاعروں اور قلم کاروں نے شرکت کی۔ تقریب کے آغاز پر اکادمی کے شعبہ اردو کے ایڈیٹر محمد اشرف ٹاک (راقم الحروف) نے ڈاکٹر حنیف ترین کا سوانحی خاکہ اور ان کے ادبی سفر کی روداد پیش کی اور بتایا کہ ڈاکٹر حنیف ترین کے اب تک نصف درجن سے زائد شعری مجموعے منظر عام پر آکر دنیا بھر میں داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ یورپ امریکہ، مشرق وسطیٰ اور پاک و ہند میں ان کی شاعری کی دھوم ہے، اور درجنوں اخباروں اور جرائد نے ان پر خصوصی نمبر شائع کیے ہیں۔ حنیف ترین اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے عصری شعری منظر نامے میں اپنے لیے بلندی پر جگہ بنا چکے ہیں۔ جہاں سے وہ عالمِ انسانیت کو درپیش مختلف مسائل اور مشکلات کا درد اپنے دل میں سموئے ہوئے ہیں اور اسے صفحہ قرطاس پر رقم کر کے مردہ ضمیروں کو جھنجھوڑ رہے ہیں۔ ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو عرب کے صحراؤں میں اردو زبان و ادب کی خدمت اور فروغ ہے۔

اس کے بعد اکاڈمی کے سکریٹری رمیش مہتہ نے مہمانوں کے استقبال اور تقریب کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ اکادمی نے حنیف ترین جیسی سربرآوردہ شخصیت کے ساتھ ایک ملاقات کا اہتمام کر کے اکادمی کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ حنیف ترین نہ صرف ایک فنکار ہیں، بلکہ انھوں نے اردو کے کاز کو آگے بڑھانے کے

لیے اپنے آپ کو وقف کیا ہوا ہے۔ ہماری اکادمی اردو کے تئیں ان کی کاوشوں کی قدر کرتے ہوئے انھیں تحسین کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

تقریب کے اس مرحلے پر کشمیر کے سر برآوردہ ادیبوں نے ڈاکٹر حنیف ترین کی کتاب 'ابابیلیں نہیں آئیں' پر اپنے تعارفی مقالے پیش کیے جن میں جناب رفیق راز صاحب جو ریڈیو کشمیر سری نگر کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہیں۔ 'ابابیلیں نہیں آئیں' پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ "ڈاکٹر حنیف ترین مشرقِ وسطیٰ میں یہودو نصاریٰ کی ننگی بربریت کے چشم دید گواہ ہیں، انھیں جہاں عالم اسلام کی حالت زار رُلاتی ہے، وہیں انھیں معلوم ہے کہ عہدِ حاضر کے مسلمان ابابیلوں کے ذریعے غیبی امداد حاصل کرنے کی شرائط پوری نہیں کرتے، عالم اسلام کے خلاف یہودو نصاریٰ کی الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے دہشت گردی کا بھی انھیں پورا احساس ہے جس کو وہ تخلیقات کے ذریعے اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ پڑھنے والا سوچنے پر مجبور ہوتا ہے اور یہی ان کی شاعری کے کامیاب ہونے کی دلیل ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر حنیف ترین سے گزارش کی گئی کہ وہ کتاب پر اپنے تاثرات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ حاضرین کو اپنی تازہ شعری تخلیقات سے نوازیں اس موقع پر حنیف ترین نے اپنے خاص انداز میں اپنی کئی مشہور نظمیں سنائیں۔ ایک مرحلے پر جب انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق نظم "باغی بچے ہوتے ہیں" سنائی تو پورے ہال پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی اور ماحول تالیوں سے گونج اٹھا۔

حنیف صاحب کی شعری تخلیقات سننے کے بعد ایوانِ صدارت (محترمی ڈاکٹر جاوید قدوس صاحب) سے گزارش کی گئی کہ وہ "ابابیلیں نہیں آئیں" کی رسم رونمائی انجام دیں۔ رونمائی کے بعد مہمان خصوصی اور صدرِ محفل صاحب نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ "حنیف ترین نے عصری اردو شاعری میں بڑی تیزی سے اپنی منفرد پہچان بنائی ہے اردو شاعری میں جتنے بھی لسانی و شعری، ثقافتی رویے سامنے آئے ہیں، حنیف ترین کچھ شعوری، کچھ لاشعوری طور پر ان سب میں شامل نظر آئے ہیں، "ابابیلیں نہیں آئیں" کے حوالے سے بغداد، کوفہ، غزہ اور خان یونس صرف مقامات ہی نہیں بلکہ، استعارے ہیں جو اپنے اندر عراق اور فلسطین ہی نہیں، بوسنیا اور گجرات تک کی جھلسی اور لٹی ہوئی بستیوں کی چیخیں اور مجبوریاں ہی نہیں اور بہت کچھ سموئے ہوئے ہیں۔ ابوغریب کے قیدیوں کے ساتھ یزیدی سلوک سے لے کر گجرات کی بلقیس اور ریحانہ جیسی بتولوں کی بے حرمتی کے واقعات کو حنیف ترین نے انودھتی رائے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ اپنی نگارشات کے اندر پیوست کیا ہے جو انھیں جدید اردو شاعری کے منظر نامے پر ممتاز و منفرد بنا رہا ہے۔ اب تک ہونے والے اکادمی کے ادبی پروگرام پر یہ محفل کامیاب ترین اور ہمیشہ کے لیے یادگار بن گئی۔

(رپورٹ: ڈاکٹر شمیم اختر، جموں اینڈ کشمیر)

غالب شناس افتخار احمد عدنی کا سانحۂ ارتحال

انجمن ترقی اردو پاکستان کے دفتر میں انجمن کے نائب معتمد اعزازی امراؤ طارق کی صدارت میں انجمن کے خازن اعزازی اور سابق بیوروکریٹ جناب افتخار احمد عدنی کے ناگہانی انتقال پر ایک تعزیتی اجلاس منعقد کیا گیا اور مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے دعا کی گئی۔

افتخار احمد عدنی ایک معتبر شاعر تھے اور غالب شناسی میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ ان کے انتقال سے جو ادبی اور سماجی خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا بہت مشکل ہے۔

اجلاس میں ایک قرارداد پیش ہوئی جس میں افتخار احمد عدنی کی انجمن ترقی اردو پاکستان کے لیے اُن کی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا اور مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

انجمن ترقی اردو کے معتمد اعزازی ڈاکٹر جمیل الدین عالی نے جناب افتخار احمد عدنی کے انتقال کو نہ صرف ایک ادبی بلکہ ایک قومی نقصان قرار دیا ہے۔

(رپورٹ: ادارہ)

انجمن ترقی اردو پاکستان کا تعزیتی اجلاس

انجمن ترقی اردو کا ایک تعزیتی اجلاس زیرِ صدارت ڈاکٹر جمیل الدین عالی منعقد ہوا جس میں ملک کے ممتاز نعت گو سید حسین علی ادیب رائے پوری کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ اجلاس میں کہا گیا کہ ادیب رائے پوری ۱۹۲۸ء میں رائے پور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ شعر و ادب سے متعلق ان کی خدمات جلیلہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ نعت و مدحت رسولؐ ان کا اختصاص تھا۔ نعتیہ مجموعے ''اس قدم کے نشان'' اور ''تصویر کمال محبت'' اور نعتیہ تنقید کی کتب ''مدارج النعت اور ''مشکوٰۃ النعت'' شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ آخر میں مرحوم کو ایصال ثواب کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

(رپورٹ: روزنامہ ''جنگ'' کراچی ۲۴ر اکتوبر ۲۰۰۴ء)

انجمن میں جیلانی بانو کے حوالے سے تقریب

گزشتہ دنوں انجمن ترقی اردو پاکستان نے ہندوستان کی ممتاز افسانہ نگار جیلانی بانو اور ان کے رفیقِ سفر ڈاکٹر انور معظم کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کرنے کا پروگرام مرتب کیا، تقریب سے چند گھنٹے پہلے ڈاکٹر انور معظم نے بہ وجوہ تقریب میں شریک نہ ہو سکنے کی معذرت کی اس سلسلے میں مقامی ادیب حضرات کو دعوت دی جا چکی تھی۔ وہ اپنے وقت پر انجمن کے دفتر میں آچکے تھے۔ چنانچہ مناسب یہ جانا گیا کہ آئے ہوئے مقامی مدعوین کی تواضع کے لیے تقریب کو ملتوی کرنے کی بجائے جاری رکھا جائے۔ انجمن کے نائب معتمد جناب امراؤ طارق نے روسٹرم پر آ کر کہا، یہ اطلاع افسوس کے ساتھ دی جا رہی ہے کہ آج کی تقریب میں جیلانی بانو اور ڈاکٹر انور معظم بہ وجوہ نہیں آ رہے ہیں۔ لہٰذا ہم انھی کے حوالے سے تقریب کو جاری رکھتے ہیں اور ڈاکٹر ممتاز احمد خاں جیلانی بانو کے فن پر اظہار خیال کریں گے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے جیلانی بانو کے ناول ''ایوانِ غزل'' اور ان کی افسانہ نگاری پر ایک مقالہ پڑھ کر سنایا۔ اس موقع پر انیس صدیقی نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس طرح تقریب اختتام کو پہنچی، حاضرین کی تواضع چائے سے کی گئی۔

(رپورٹ: ادارہ)

اسلام آباد میں مجلسِ محصورین پاکستان کے مجلّے "حصار" کی تقریب رونمائی

گزشتہ دنوں اسلام آباد کے ایک ہوٹل کے آڈیٹوریم میں مجلسِ محصورین پاکستان (پی آر سی) کے زیر اہتمام شائع ہونے والے دیدہ زیب مجلّے "حصار" کی تقریب رونمائی بے حد پروقار انداز میں منائی گئی جس کی صدارت تحریکِ پاکستان کے ممتاز رہنما، بزرگ سیاستدان اور وفاقی وزیر جناب محمود علی نے کی۔ یاد رہے کہ مجلسِ محصورین پاکستان ان اڑھائی لاکھ سے زیادہ محب وطن پاکستانیوں کی وطن واپسی کے لیے سرگرمِ عمل ہے جو سقوطِ مشرقی پاکستان سے لے کر اب تک بنگلہ دیش کے کیمپوں میں محصور کس مپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ "حصار" کے عنوان سے شائع ہونے والا مجلّہ بھی انھی مسائل کا ایک تسلسل ہے جس کے ذریعے اہل اقتدار اور اختیار، اہلِ دانش، اہلِ قلم اور پاکستان کے خواص و عوام کی توجہ اس اہم مسئلے کی جانب دلائی گئی ہے جسے اہلِ پاکستان اپنی دیگر مصروفیات اور ترجیحات کی نذر کر چکے ہیں جب کہ وہ اڑھائی لاکھ سے زیادہ محبِ وطن پاکستانی حکومتِ بنگلہ دیش کی جانب سے بنگالی قومیت کی پیش کش کو ٹھکرا کر آج بھی اپنے کیمپوں میں جہاں کہ وہ جانوروں سے بھی بدتر حالات میں زندگی گزار رہے ہیں، اپنے وطن پاکستان کا نام لے رہے ہیں اور وہاں آج بھی سبز ہلالی پرچم لہرا رہے ہیں۔ یہ مجلّہ اردو، عربی اور انگریزی زبانوں میں شائع کیا گیا

علمی تحقیق کا نادر شاہکار، کلیات سازی کا معیاری نمونہ

پاکستان کی علمی تاریخ میں ایک تاریخ ساز کام

کلیاتِ یگانہ

میرزا یگانہ چنگیزی

مرتبہ: مشفق خواجہ

صفحات: ۹۶۰ قیمت: ۵۰۰ روپے

رابطہ: اکادمی بازیافت، اردو بازار، کراچی

غالب کی بعض تصانیف

از

کالی داس گپتا رضا

صفحات: ۱۵۴ قیمت: ۱۲۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

تاریخ انجمن بابائے اردو کے بعد

از: شہزاد منظر

تکملہ: ادیب سہیل

صفحات: ۳۲۹ قیمت: ۱۷۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

منتشر یادیں

از

نورالحسن جعفری

صفحات: ۲۴۸ قیمت: ۱۵۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

Regd M. No. 270 Phone: 4811406

Monthly QAUMI ZABAN Karachi

انجمن کی مجوّزہ عمارت کا نقشہ

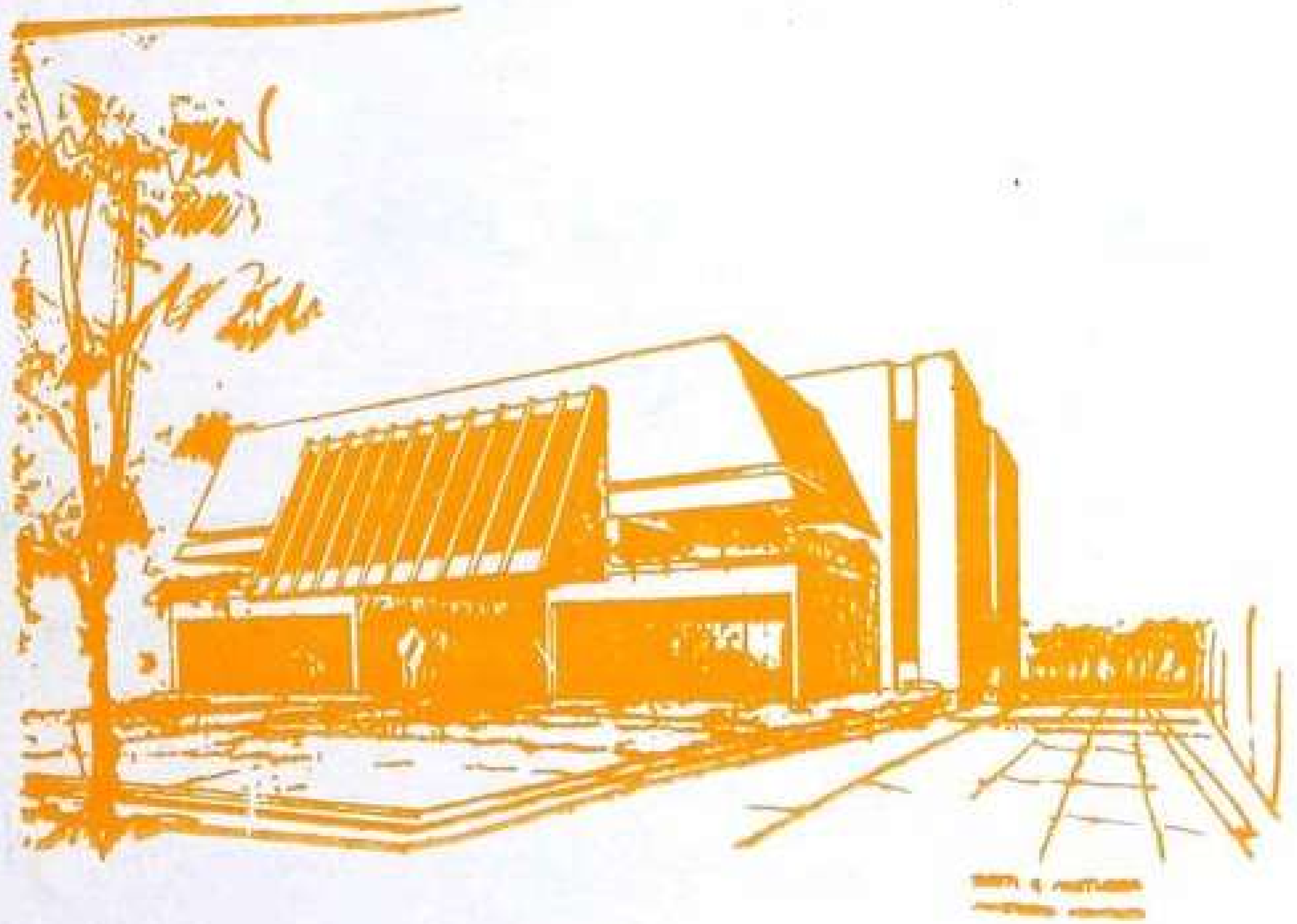

ایک خواب
جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر: ادیب سہیل، طابع: احمد برادرز ناظم آباد کراچی مقام اشاعت ڈی ۱۵۹ ابلاک (۷) گلشن اقبال کراچی